درد کا سفیر

منور علی ملک

جو ساز سے نکلی ہے صدا سب نے سُنی ہے
جو تار پہ گذری ہے وہ کِس دِل کو پتا ہے
(ساحرلُدھیانوی)

(جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں)

نام کتاب: درد کا سفیر

مصنف: منور علی ملک

اشاعت ثانی: اگست 2004ء

ناشر: رانا شمشاد علی، نیو نفیس بک ڈپو، مین بازار میانوالی

گرافکس: ناصر خان، سٹی کلر لیب میانوالی

نجیب الرحمٰن، رحمانیہ پرنٹنگ پریس میانوالی

قاسم ملک (0300-4539612) نیو کتاب محل اردو بازار لاہور

کمپوزنگ و ترتیب: سجاد الثقلین، نیو کتاب محل اردو بازار لاہور

طباعت: سویرا آرٹ پریس، 15 سرکلر روڈ لاہور

ملنے کا پتہ: نیا ادارہ سرکلر روڈ لاہور

سرائیکی سر سنگت، وتہ خیل کیسٹ ہاؤس

سانول کیسٹ ہاؤس میانوالی

تعاون: لیاقت علی خان، کوثر حیات خان، شوکت حیات خان

محمد رمضان خان، شفاء اللہ، عصمت گل خان خٹک، مظہر نیازی

قیمت: -/110 روپے

عطاء کے لختِ جگر

سانول عطاء

کے نام

آپ کہیں اور ہم نہ بتائیں۔۔۔۔!

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی اور بحمد اللہ اتنی مقبول ہوئی کہ پاکستان کے چاروں صوبوں کے علاوہ بیرونِ ملک مقیم پاکستانیوں سے بھی تحسین کے خطوط موصول ہوئے، بلکہ آج بارہ سال بعد بھی کہیں نہ کہیں سے اس کتاب کے حوالے سے کوئی نہ کوئی حوصلہ افزا خط آ جاتا ہے۔ مثلاً پچھلے ہفتے فیصل آباد سے ندیم صاحب کا خط آیا، انہوں نے کتاب کو سراہتے ہوئے اس کی دوسری جلد شائع کرانے کی فرمائش کی۔

کچھ عرصہ قبل ساہیوال سے ایک صاحب کا خط موصول ہوا۔ لکھتے ہیں۔

''آپ کی کتاب درد کا سفیر کی بہت تعریف سنی تھی۔ اوکاڑہ اور لاہور کے کسی بک سیلر کے ہاں سے بھی کتاب نہ ملی تو عیسیٰ خیلوی صاحب کے دفتر (لاہور) پہنچا۔ ان کے سیکرٹری تنویر شاہد صاحب کے پاس کتاب کی ایک ہی کاپی تھی۔ انہوں نے کہا آپ کتاب دیکھ تو سکتے ہیں مگر لے کر جانے کی اجازت نہیں۔ میں نے وہیں بیٹھ کر ایک ہی نشست میں پوری کتاب پڑھ ڈالی۔ اتنی پسند آئی کہ اس کی فوٹو کاپی بنوا کر جلد سازی کروائی اور وہی فوٹو کاپی اب میری لائبریری کی زینت ہے۔''

بیشتر قارئین نے کتاب ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔ اور تاثرات بھی تقریباً سب لوگوں کے ایک جیسے ہی رہے۔ سب نے کہا کہ کتاب پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا رہا جیسے ہم بھی میکدہ کی محفل میں آپ کے ساتھ عطاؔء کے سامعین میں شامل ہیں۔ بہاولپور سے میرے دوست روزنامہ امروز کے سب ایڈیٹر اور معروف ڈرامہ نگار مسرت کلانچوی کے شوہر اسلم ملک نے کہا۔۔۔

''میں اپنی بیوی کے ساتھ پی آئی اے کی فلائیٹ سے پشاور سے لاہور آ رہا تھا۔ پرواز کے دوران درد کا سفیر کا باب ''سیما بہن ہم تم کو نہیں بھولے۔'' پڑھ کر ہم دونوں پشاور سے لاہور تک روتے آئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔''

کتاب کی پذیرائی کے حوالے سے قارئین کے خطوط میں سے اقتباسات پیش کروں تو اتنی ہی ایک الگ کتاب بن جائے۔ الحمد للہ اندازِ تحریر کو سب نے سراہا اور لکھتے رہنے کی فرمائش کی۔ کئی لوگوں نے یہ بھی کہا کہ ''درد کا سفیر'' کے علاوہ اگر آپ کی کوئی اور کتاب ہے تو ہم وہ بھی پڑھنا چاہیں گے۔

یہ باتیں کہنے کا مقصد اپنی تعریف نہیں، کیونکہ اگر میری تحریر میں کوئی خوبی ہے تو کمال میرا

نہیں، میرے خالق کا ہے۔ دینے والے کا کرم دیکھئے کہ میانوالی کے ایک فقیر سے شخص کو یہ خوبی عطا کر دی۔

کتاب کا دوسرا حصہ یا دوسرا ایڈیشن لانے کا مطالبہ مسلسل ہوتا رہا۔ مگر مصروفیات نے ادھر متوجہ ہونے کی اجازت نہ دی۔ عطاؔ نے بھی یہ مطالبہ کیا، مگر جو معلومات مجھے درکار ہیں ان کے لئے ہم دونوں کا کم از کم ایک ہفتہ مل بیٹھنا ضروری ہے۔ اتنی فرصت فی الحال اِدھر نہ اُدھر، سو کتاب کا دوسرا ایڈیشن لانے کی بجائے حسبِ توفیق اضافے کے ساتھ طبعِ ثانی پر اکتفا کیا کرنا پڑ رہا ہے۔

قارئین کی دلچسپی کا خیال رکھتے ہوئے اس میں کچھ نئی باتیں بھی شامل کر دی ہیں۔ مثلاً بعض معروف گیتوں کے حوالے سے لوگ ان گیتوں کے لکھنے والے شعراء سے بھی متعارف ہونا چاہتے ہیں۔ ان میں سے بعض شعراء (برؔی نظامی، نیر سوؔچ) تو اب اس دنیا میں موجود نہیں۔ بقیہ دوستوں سے رابطے کی کوششوں میں خاصا وقت لگ گیا۔

موجود شعرائے کرام میں سے بیشتر حضرات نے میری گذارش پر اپنے بارے میں کچھ معلومات فراہم کر دیں۔ بعض حضرات بار بار یاد دہانی کے باوجود ادھر متوجہ نہیں ہو سکے۔ شاعروں کی توجہ حاصل کرنا آسان نہیں ہوتا۔ یہ لوگ حسن پرست ضرور ہوتے ہیں۔ مگر ان کے معیارِ حسن پر پورا اُترنا ہر حسین کے بس کا روگ نہیں، ورنہ جن حسینوں سے اپنی رسم وراہ ہے، ان میں کسی کی سفارش کروادی جاتی۔ ایک سینیئر دوست کو یہ پیشکش کی تو ایک لمبی سرد آہ بھر کر کہنے لگے۔

"لالا! حسن کی دیوی تو بس ایک ہی تھی، جو ہمارے ہاتھ سے نکل گئی، اب باقی دنیا سے ہمیں کیا واسطہ؟"

"درد کا سفیر" شعر کی طرح ایک خاص تخلیقی کیفیت میں سرزد ہوئی۔ اس کیفیت میں تحقیق اور جزئیات کی تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ملتا۔ مگر بات بے ساختہ اور موثر ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ کتاب اتنی موثر اور مقبول ثابت ہوئی۔ مگر بہت سی ضروری باتیں کتاب میں شامل ہونے سے رہ گئیں۔ مثلاً کتاب شائع ہوئی تو چند روز بعد عطاؔ کے اکلوتے بھائی ثناء اللہ خان عرف لالا شنوؔ کا خط موصول ہوا۔ چھوٹے بھائی کا دردناک مگر بجا شکوہ پڑھ کر بے اختیار آنکھیں بھر آئیں۔ شنوؔ نے لکھا تھا۔

"لالا! درد کے سفیر میں آپ نے مجھے گھر سے لالؔا کا ایکسرے لانے کے لئے بھیجا، مگر واپسی کا انتظار نہ کیا، کتاب میں چھوٹے بھائی کے حصے میں فقط ایک یہی فقرہ آیا۔ اس کے بعد میرا کبھی ذکر نہ ہوا۔ بھلا بتایئے جو بھائی ٹھیک رات بارہ بجے بلاناغہ آپ سب کے لئے چائے بناتا اور پھر برتن دھوتا رہا کیا اس کا حق اتنا ہی بنتا تھا؟"

اس کے بعد شنوؔ سے جب بھی ملاقات ہوئی شرمندگی سے میری نظریں جھک گئیں۔ "شنوؔ سب اہلِ میکدہ کا بہت پیارا بھائی ہے۔ اب ماشاءاللہ بچوں کا باپ ہے۔ جب میکدہ آباد تھا اس

وقت یہ بمشکل دس بارہ برس کا تھا۔ بڑے بھائیوں کی خدمت کرنا کوئی اس سے سیکھے۔ اب بھی یہ بدستور ہر وقت مستعد اور خدمت پہ کمر بستہ رہتا ہے۔ کبھی رات بارہ بجے لالا فون پر حکم دیتے ہیں۔ ''شنو میں صبح ۲ بجے عیسیٰ خیل پہنچوں گا۔ پانچ سات آدمیوں کا کھانا تیار کروا دینا۔'' لالا یہاں پہنچتے ہیں تو کھانا تیار ملتا ہے۔ صبح ناشتے میں مہمانوں کی تعداد پانچ سات سے بڑھ کر دس بارہ ہو جاتی ہے۔ دوپہر کے کھانے میں بیس پچیس اور شام کے کھانے میں تیس پینتیس۔ مگر کھانا نہ کبھی کم پڑتا، نہ دیر سے آتا ہے۔ یہ ہے شنو کا حسنِ انتظام! اور یہی ایک کام نہیں، شنو کوٹھی کے وسیع و عریض لان میں لگے ایک ایک پودے کی ضرورت کا خیال رکھتا ہے۔

لالا کے موجودہ شب و روز کے حوالے سے بھی لوگ سب کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ سب کچھ کہنے کی اجازت دینا تو لالا Afford نہیں کر سکتا۔ چند گفتنی باتیں میں نے لکھ دی ہیں۔ تفصیل سے بات اگلے ایڈیشن میں ہو گی۔

بعض احباب نے کہا کہ ''درد کا سفیر'' میں آپ نے لالا کو عیسیٰ خیل سے لاہور پہنچا کر اس کے بعد کچھ پتہ نہیں بتایا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ لالا جیسے جہاں گرد فنکار کا ہر جگہ ساتھ تو اس کے بیوی بچے بھی نہیں دے سکتے۔ آج کراچی میں کوئی تقریب ہے تو کل پشاور میں اور پرسوں پچھو کی ملیاں جیسی گمنام جگہ پر۔ یہ ماھیا شاید کسی نے ''لالا'' کے بارے میں ہی کہا تھا۔

دِلا ہنڑں بس چا کر ڈھولا کتھے کتھے نال ہووے

دن رات سفر ہو تو سایہ بھی تھک ہار کر بیٹھ جاتا ہے اور ہمیں تو ویسے بھی میانوالی سے باہر جھانکنے کی فرصت کم ہی ملتی ہے۔ لالا کے اکثر دوست ظفر خان نیازی کا یہ شعر الاپتے سنائی دیتے ہیں:

وفا کی آس اسی یارِ بے وفا سے ہے
بدن ہے راکھ، مگر دوستی ہوا سے ہے

مگر لالا کی بے وفائی اس لئے قابلِ معافی ہے کہ پرندوں کی طرح اس کا رزق بھی پورے کرۂ ارض پر بکھرا ہوا ہے۔

قارئین کے لئے اچھی خبر یہ ہے کہ اب لالا نے بھی کتاب کا دوسرا حصہ لانے کی فرمائش کر دی ہے۔ جواب میں میں نے اپنی شرط بھی بتا دی ہے۔ لہٰذا جوں ہی ہم دونوں کو مل بیٹھنے کی فرصت نصیب ہوئی یہ کام انشاء اللہ ہو جائے گا۔ آپ لوگ انتظار کریں اور ہمارے لیے دعا بھی۔

منور علی ملک

۲۸ اگست ۲۰۰۳ء

جواز

''کیا ضرورت ہے مجھ پر کتاب لکھنے کی؟'' عطا نے ہنس کر کہا۔

''لوگ تو میرے بارے میں پہلے ہی خود مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ مثلاً انہیں یہ بھی علم ہے کہ میں اب تک کم از کم چار مرتبہ مر چکا ہوں۔ میرے عشق کی داستان بھی انہیں حرف بہ حرف معلوم ہے۔ ایک صاحب سے یہ بھی سنا کہ عشق کے جرم میں، میں سات سال قید با مشقت کاٹ چکا ہوں۔ جیل سے رہا ہو کر کچھ عرصہ پاگل خانے میں بھی گذارا، اور وہاں سے نکلا تو اپنی محبوبہ کو اغواء کر کے بیرونِ ملک چلا گیا اور بقیہ زندگی وہاں بیٹھ کر کیسٹیں ریکارڈ کرواتا رہا۔ غرض میری زندگی کے ایک ایک لمحے کا احوال تو لوگ جانتے ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میرے بارے میں کسی کتاب کی گنجائش ہے؟

''نہ سہی لالا'' میں نے ہنس کر جواب دیا ''مگر جب اتنے لوگ تمہارے بارے میں جھوٹ بول سکتے ہیں تو میرا بھی کچھ حق بنتا ہے۔ جھوٹ بولنے کا اپنا عمر بھر کا تجربہ تمہارے کام نہ آیا تو اور کس کام آئے گا؟''

''تمہارا تجربہ تمہیں مبارک ہو منور بھائی! تو تم بھی میرے بارے میں جھوٹ ہی بولنا چاہتے ہو؟''

''نہیں لالا! وہ تو میں نے ازراہِ مذاق کہہ دیا۔ میں دراصل سچ لکھنا چاہتا ہوں۔''

''سچ''

’جی ہاں‘

’’میرے بارے میں؟‘‘

’’ہاں تمہارے ہی بارے میں‘‘

’’دیکھو، میں منع نہیں کرتا‘ سوچ لو۔ اچھی طرح سوچ لو!‘‘

’’میں سمجھ گیا‘ لالا! یہ درست ہے کہ تمہارے بارے میں سچ لکھنا بہت مشکل ہے

کیونکہ

اس میں کچھ پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں

اوران پردہ نشینوں کے لواحقین میری جان کے درپے ہو جائیں گے، مگر میں بہت بچ بچا کر لکھوں گا، میری جان۔ پھر بھی اگر شک وشبے کی بناء پر بات تھانے کچہری تک جا پہنچی تو ایف آئی آر میں تمہارا نام نہیں آنے دوں گا۔ کتاب تو بہر حال میں لکھوں گا

چاہے لگ جائے جان ہتھکڑیاں

عطاء ہنس دیا۔ پھر یک لخت سنجیدہ ہو گیا۔

’’اچھا یہ بتاؤ، کتاب میں اُس کا ذکر تو نہیں کرو گے؟‘‘

’’ہرگز نہیں‘ تمہاری مصلحتوں سے زیادہ اس کی مجبوریوں کا لحاظ ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے!‘‘ عطاء نے ایک اداس تبسم کے ساتھ، آہ بھر کر کہا‘ اور جو کچھ چاہو لکھ دو۔ مجھے قطعاً کوئی اعتراض نہ ہو گا، مگر باتیں سچ سچ لکھنا، شاعری نہ کرنا۔‘‘

ہم نے آخری شرط بھی منظور کر لی اور اللہ کا نام لے کر کتاب لکھنے کا عہد پورا کرنے بیٹھ گئے۔

سچ لکھنے کی شرط نبھانے کے لیے اس کتاب میں صرف ذاتی تجربات ومشاہدات پر اکتفا کرنا ضروری ہو گیا۔ اور اسی لیے یہ کتاب روایتی سوانح حیات بننے سے بچ گئی۔ سچ پوچھئے تو ہم چاہتے بھی یہی تھے۔

اس کتاب میں عطاء کے بارے میں بیشتر سوالوں کے جواب ہی نہیں، بعض ایسے سوال بھی ہیں جن کے جوابات کی جستجو میں خود عطاء بھی قریۂ حیرت کی پیچ در پیچ گلیوں میں ایک عرصہ سے سرگرداں ہے۔ ہر گلی میں بے شمار دروازے ہیں کچھ کھلے، کچھ نیم وا، کچھ بند۔ انہی میں سے کسی ایک دروازے کے اس طرف عطا کے سب سوالوں کے جواب موجود ہیں۔ مگر تا حال عطاء وہ دروازہ دریافت نہیں کر سکا۔

انداز بیاں کی شوخی بعض سنجیدہ مزاجوں پر گراں گزرے گی، مگر بہ صد معذرت عرض کروں گا کہ صاحب کیا کروں، کسی اور طرح لکھنا ہی نہیں آتا۔ کہتے ہیں نا، کہ ایک

صاحب نے دوسرے صاحب سے کہا:

''خیرت تو ہے، بھائی جان! آپ کیوں رو رہے ہیں؟''

''رو نہیں رہا ہوں جانِ من، قدرت نے صورت ہی ایسی بنائی ہے۔'' دوسرے صاحب نے آہ بھر کر جواب دیا۔

سو، عرض یہ ہے کہ قدرت نے اندازِ تحریر ہی ایسا دیا ہے۔ اس میں ہمارا کیا قصور؟

ہمارے علاقے میں جیدن شاہ نامی ایک بزرگ ہوا کرتے تھے۔ پیدائشی مجذوب۔ تقریباً ستر برس کی عمر میں وفات پائی۔ اس وقت تک تو ہوش نہیں سنبھالا تھا۔ مرنے کے بعد کا ہمیں علم نہیں۔

جیدن شاہ کی سب سے منفرد خصوصیت یہ تھی کہ بارات ہوتی یا جنازہ، شاہ صاحب جلوس کے آگے رقص کرتے ہوئے اسے منزلِ مقصود پر پہنچا کر ہی لوٹتے۔ لوگوں نے بار ہا ٹوکا، مارا پیٹا بھی، مگر شاہ صاحب نے بارات اور جنازے کا فرق مان کر نہ دیا۔ کم عقل لوگوں کو کیا معلوم، کہ بعض جنازے بارات اور بعض باراتیں جنازے ہوا کرتی ہیں۔ آپ نے میرے بڑے بھائی ملک انور علی کا جنازہ نہیں دیکھا۔ حد نظر تک آدمی ہی آدمی۔ میں نے زندگی میں انور سے زیادہ حسین دولہا نہیں دیکھا۔ یہ بات میں اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ انور میرے بھائی تھے۔ وہ جس کے بھائی بھی ہوتے، ان کا جنازہ اسی شان سے اٹھتا۔ حسن کردار کا نور میت کو بھی دولہا بنا دیتا ہے۔

بات عالم فانی کی سرحد کے اس پار نکل گئی۔ کہنا یہ چاہتا تھا کہ اپنا اندازِ تحریر جیدن شاہ کی زندگی جیسا ہے۔ ہنسنے اور رقص کرنے کے علاوہ شاہ صاحب کو کوئی اور کام نہ کرتے دیکھا۔ میرے لفظ بھی آپ کو یہی کچھ کرتے نظر آئیں گے۔ لفظوں کا یہ جا بے جا رقص آپ کو ناگوار گذرے تو یہ سوچ کر معاف کر دیجئے گا کہ لکھنے والا بیچارہ پاگل ہے۔ اسے کیا معلوم کہ لکھنا کسے کہتے ہیں۔''

لکھنے میں ایک مشکل یہ رہی کہ پانچ چھ سال سے لکھنے کا کاروبار صرف ان تحریروں تک محدود رہا جو ہم پاکستان ٹائمز اور دی نیشن وغیرہ کے لیے لکھتے رہے۔ انگریزی کم بخت میں ایک خوبی یا خامی یہ ہے کہ جسے اس زبان میں لکھنا آجائے وہ کسی اور زبان کے کام کا نہیں رہتا۔ اس زبان کا ایک اپنا مزاج اور مزا ہے۔ لفظ کسی جبر و تشدد کے بغیر اس قدر سلیقے سے اپنی اپنی جگہ سنبھال لیتے ہیں کہ لکھنے والا حیرت سے انہیں دیکھتا رہ جاتا ہے۔

انگریزی کے فضائل بیان کرنے کا مقصد اردو کی تحقیر کرنا بلکہ اردو پر اپنی گرفت کمزور پڑنے کا سبب بیان کرنا ہے۔ بعض لفظوں کی تکرار اچھی نہ لگی، مگر کوشش

کے باوجود کوئی متبادل لفظ ہاتھ نہ آسکا۔ اردو سے مسلسل بے اعتنائی کی اتنی سزا تو ملنی ہی چاہیے تھی۔ یہ الگ بات کہ اردو سے بے اعتنائی بلاوجہ نہ تھی۔ اردو لکھنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ کسی مؤثر سفارش اور وسیلے کے بغیر میانوالی جیسے دور اُفتادہ علاقے کے لکھاریوں کو رسائل و جرائد میں ایک انچ جگہ بھی نہیں مل سکتی۔ ایک آدھ تلخ تجربے کے بعد میں نے اس میدان میں قسمت آزمائی کا خیال ہی دل سے نکال دیا اور انگریزی میں ایک شوخ سی تحریر کسی سفارش اور وسیلے کے بغیر روزنامہ ''پاکستان ٹائمز'' کے محمد ادریس صاحب کو بھجوادی۔ چند روز بعد وہ تحریر بڑے نمایاں انداز میں شائع ہوگئی۔ اس سے میرا حوصلہ بڑھا اور باقاعدگی سے ''پاکستان ٹائمز'' کے لیے لکھنا شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ ''پاکستان ٹائمز'' کے میگزین ایڈیٹر سید سرور شاہ صاحب وہاں سے ریٹائرڈ ہوکر ''نیشن''، میں چلے گئے تو مجھے ''نیشن'' کے لیے لکھنے کی دعوت دی۔ یوں ''نیشن'' میں بھی باریابی حاصل ہوگئی۔

''پاکستان ٹائمز'' سے وابستگی کا حاصل جناب اقبال جعفری اور محمد سلیم الرحمٰن جیسے اہل علم و قلم احباب سے یاری کا اعزاز ہے۔ میرے بارے میں ان احباب کی رائے سے متاثر ہوکر ''پاکستان ٹائمز'' کے سابق چیف ایڈیٹر جناب مقبول شریف نے مجھے ''پاکستان ٹائمز'' کے لیے روزانہ فکاہیہ کالم لکھنے کی دعوت بھی دی۔ مگر میانوالی میں بیٹھ کر لاہور کے اخبار کے لیے لکھنا عموماً ناممکن تھا، اس لیے میں نے معذرت کرلی۔ یہ سب اعزازات اپنی جگہ مگر ہماری بدنصیبی بھی دیکھئے کہ اپنے محسن ادریس صاحب سے ملاقات کا شرف کبھی حاصل نہ ہوسکا۔ ایک آدھ مرتبہ ''پاکستان ٹائمز'' کے دفتر جانے کا اتفاق ہوا تو ادریس صاحب دفتر میں موجود نہ تھے۔ خیال تھا کہ اس مرتبہ نہ سہی تو آئندہ کبھی نہ کبھی ملاقات ہو ہی جائے گی۔ مگر ایک دن اچانک معلوم ہوا کہ اب ان سے ملاقات کبھی نہ ہوسکے گی۔

اپنے مطبوعہ انگریزی مضامین کا مجموعہ ڈھائی تین سوصفحے کی کتاب کی شکل میں شائع کرانے کا ارادہ ہوا تو ضمیر نے دو قرض یاد دلا دیئے، جن کی ادائیگی بہر حال واجب تھی۔ ایک قرض عطاء کا، دوسرا اردو کا۔ لہٰذا فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے یہ قرض ادا کرلوں۔

اس کتاب کے سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ تین طرح سے پہلی کتاب ہے۔ میری پہلی کتاب، عطاء پر پہلی کتاب اور میری دانست کی حد تک برصغیر میں کسی گلوکار پر پہلی کتاب۔ تیسری صورت میں یہ پہلی کتاب نہ بھی ہو تو اس قسم کی کتابوں کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ ہمارے نامور گلوکاروں کا یہ حق اہلِ قلم کے ذمے واجب الادا ہے۔ سیاسی اور غیر سیاسی حکمرانوں پر کتابیں لکھی جارہی ہیں تو فن کی خدمت کے ذریعے لوگوں

کے دلوں پر حکمرانی کرنے والوں پر کتابیں کیوں نہ لکھی جائیں؟ امانت علی خاں، ملکہ ترنم نور جہاں، جناب مہدی حسن، جناب غلام علی اور بیسیوں دوسرے نامور فنکار ہماری ثقافت کی تاریخ میں عصرِ حاضر کے برسرِ اقتدار لوگ ہیں۔

عطاء سے میری محبت میانوالی کے حلقہ احباب میں اکثر چھیڑ چھاڑ کی زد میں آتی رہتی ہے۔ ایسے موقعوں پر میرا جواب یہ ہوتا ہے کہ بے شک عطا سے میری دوستی خاصی پرانی ہے، مگر اتنی پرانی بھی نہیں جتنی آپ لوگ سمجھ رہے ہیں۔ ہمارا تعارف اس وقت ہوا جب ہم دونوں ایک دوسرے کو کچھ لینے دینے کے قابل نہ رہے تھے۔

دردبھری سریلی آوازیں ہمیشہ میری کمزوری رہی ہیں۔ دردبھری والی شرط کی وجہ سے میرے پسندیدہ گلوکاروں کی فہرست بہت مختصر ہے۔ بھارت کے فلمی گلوکاروں میں طلعت محمود، رفیع، مکیش اور لتا جی، پاکستانی پرانے فلمی گلوکاروں میں سائیں اختر، عنایت حسین بھٹی، زبیدہ خانم، مالا۔ موجودہ گلوکاروں میں اخلاق غیر فلمی گلوکاروں میں استاد امانت علی خان اور غلام علی۔ ان کے علاوہ بقیہ سب بڑے بڑے ناموں کا احترام ضرور کرتا ہوں، پسند کی بات الگ ہے۔ لوک گلوکاروں میں سے سب سے زیادہ عطاء کی آواز نے متاثر کیا اور خوش قسمتی سے ایک عرصہ تک اس کا قرب بھی میسر آ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عطا کا تعارف میانوالی میں بھی گنے چنے لوگوں تک محدود تھا، مگر یقین کیجئے میرا دل اس وقت بھی یہ گواہی دیتا تھا کہ یہ آواز اپنے دور کی سب سے منفرد اور مؤثر آواز ہے۔ لہٰذا یہ آواز کوئی نہ کوئی بلند مقام ضرور حاصل کرے گی۔ بنانے والے نے ایسی آواز صرف چند لوگوں کی سماعت کے لیے نہیں بنائی۔

بے شک دورافتادگی اور بے چارگی کے اس دور میں اس آواز کے وسیع تر تعارف کے وسائل کا نام ونشان تک نہ تھا، مگر دل یہ کہتا تھا کہ وسائل کسی نہ کسی طرح ضرور پیدا ہو جائیں گے۔ اس یقین کی بنیاد اس ایمان پر تھی کہ اس آواز کو بنانے والا وسائل تخلیق کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ اور بالکل یہی ہوا۔ وسائل ہاتھ باندھے عطاء کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ ان کی تلاش میں عطاء کو کسی در پہ دستک نہ دینی پڑی۔ کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہ کرنا پڑا۔

میں نے عطاء کا عروج لمحہ بہ لمحہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اور عام لوگوں کے برعکس مجھے اس پر ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی، کیونکہ مجھے یقین تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ حیرت ایسا نہ ہونے پر ہوتی۔ عطاء صحیح معنوں میں اس مقام کا مستحق تھا جو اس کو نصیب ہوا۔

اس کتاب میں، میں نے عطاء کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس پر مبالغہ آمیزی کا شبہ

ان لوگوں کو یقیناً ہوگا جنہوں نے عطاء کو قریب سے نہیں دیکھا۔اس کے برعکس عطاء کو قریب سے دیکھنے والے لوگوں کو یہ شکوہ ہوگا کہ بہت سی باتیں لکھنے سے رہ گئیں۔ان دونوں اعتراضات کے جواب میں، میں صرف اتنا کہوں گا کہ عطاء کو میری نظر سے دیکھیں تو آپ کو میرے الفاظ میں نہ مبالغہ نظر آئے گا، نہ تخفیف۔یہ کتاب عطاء کی جو تصویر پیش کرتی ہے وہ ایک انسان کی بنائی ہوئی ہے۔مگر یہ تصویر جامد نہیں متحرک تصویر ہے۔کتاب میں عطاء آپ کو چلتا پھرتا، زندہ و متحرک نظر آئے گا ایک متحرک تصویر سے کسی انسان کی خوبیوں اور خامیوں کا اندازہ آپ نہ کرسکیں تو قصور آپ کا ہوا۔میرا نہیں۔

بہت سی قابلِ ذکر باتیں اس کتاب میں شامل ہونے سے رہ گئیں ان میں سے کچھ باتیں تو ایسی ہیں جو لکھتے وقت یاد نہ آسکیں۔بعد میں یاد آئیں تو اس خیال سے انہیں رہنے دیا کہ یہ خدانخواستہ عطاء پر آخری کتاب تو ہے نہیں، لہٰذا انہیں آئندہ کتاب میں شامل کرلیا جائے گا۔فی الحال اگر انہیں لکھنے بیٹھوں تو نہ صرف اس کتاب کی اشاعت میں کئی ماہ کی تاخیر ہوگی۔بلکہ کتاب کی ضخامت بھی ناگوار حد تک بڑھ جائے گی۔کچھ باتیں دلچسپی کے لحاظ سے قابلِ ذکر تو تھیں، مگر ان کے ذکر سے کسی نہ کسی دوست کی دل آزاری کا امکان تھا۔اس لیے انہیں بھی چھوڑنا پڑا۔تاہم اگر کچھ احباب کا ذکر اس کتاب میں موجود نہ ہو تو بہ صد معذرت ان سے گذارش کروں گا کہ تمام تر قصور میرے حافظے کا ہے۔اور اس کی تلافی اس کتاب کی آئندہ اشاعت میں ضرور کروں گا۔

عطاء کے جن احباب سے تعارف کا اعزاز تا حال میں حاصل نہیں کرسکا۔ان سے التماس ہے کہ وہ اپنا مختصر تعارف اور عطا سے دوستی کے حوالے سے قابلِ ذکر واقعات لکھ کر مجھے بھیج دیں۔عین ممکن ہے کہ ان خوشگوار یادوں سے ایک اور کتاب مرتب ہوجائے۔

کتاب میں بعض نازک مقامات اور افراد اور جگہوں کے نام احتیاطاً بدل دیئے ہیں۔تاہم یہ معمولی سا ردوبدل عطاء کے معاشقوں کے ضمن میں کیا گیا، بقیہ سب نام اصلی ہیں۔

وہ محفلیں

میکدہ تصویر

یہ ہے میکدہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

زیرو کے بلب کی سانولی سوگوار روشنی میں ملبوس ایک سادہ سا کمرہ۔۔۔۔فرنیچر سے نا آشنا۔۔۔مگر یہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کے لیے فرنیچر کی ضرورت ہی کیا ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ ہر شام سب سے پہلے ماسٹر وزیر آ کر دری کے ایک کونے پر چپ چاپ اکڑوں بیٹھ جاتے ہیں۔ کے ٹو کے سگریٹ کا کڑوا کسیلا دھواں دور ہی سے ان کی وجود کی خبر دیتا ہے۔

ماسٹر وزیر میکدے کی معروف ترین شخصیت ہیں۔سانولی رنگت، درمیانہ قد، دھان پان سا جسم، چہرے پر شریر سا بھولپن۔جس پر پہلی نظر میں حماقت کا گمان ہوتا ہے۔مگر اندر سے بڑے سیانے ہیں یہ صاحب۔عام معاملات میں تو ان کی دانائی اپنی مثال آپ ہے۔ مگر کوئی حسین چہرہ دیکھتے ہی اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔اس لیے محفل میں اکثر چھیڑ چھاڑ کا نشانہ بنے رہتے ہیں۔بالخصوص عطا سے ان کی نوک جھونک بڑی دلچسپ ہوا کرتی ہے۔

ہاں تو! ماسٹر وزیر میکدے میں دری کے ایک کونے پر اکڑوں بیٹھے اپنے مستقبل پر غور کر رہے ہیں۔ہم وارد ہوتے ہیں۔''السلام علیکم، ماسٹر صاحب۔''

''وعلیکم السلام۔آ گئے' ملک صاحب؟''

''لالا (عطاء) ابھی نہیں آیا؟''

''آتا ہی ہو گا۔''

پھر لالا نمودار ہوتا ہے۔علیک سلیک کے بعد دائیں جانب کے کمرے سے ہارمونیم اٹھالاتا ہے۔ہارمونیم دیکھتے ہی ایک عجیب سا سرور ہمارے رگ وپے میں تیر جاتا ہے۔ لالا ہارمونیم پر ہلکے سروں میں کوئی لوک دھن چھیڑ کرآہستہ سے کھنکارتا ہے۔آغازِ سخن عموماًڈوھڑے سے ہوتا ہے۔لالا کی گھمبیر پرسوز آواز کمرے میں گونج اٹھتی ہے۔ جوگ کے کرب میں تڑپتے ہوئے یہ بول فضا میں بکھر جاتے ہیں:۔

دو دل ٹٹ گئے' لٹ چمن گیا' تے ھک کوک معشوق دی آئی

کتھے یار گئیوں میں اُجڑی دا' میں پھر دیاں وانگ سودائی

''جیویں لالا' جیویں''۔۔۔۔۔۔یہ ماسٹر وزیر کی مخصوص داد تھی۔

اس کے ساتھ ہی لالا کی انگلیاں بجلی کی سی سرعت سے ہارمونیم کے آخری سروں تک جا پہنچتی ہیں اور ڈوھڑے کے یہی بول ایک دردناک چیخ بن کر در و دیوار پر بھی رقت طاری کر دیتے ہیں۔

پہلے مصرعہ میں''گئے'' کے لفظ پر پہنچ کر یہ چیخ اتنی طویل ہو جاتی ہے کہ ایک انجانے خوف سے ہمارا دم گھٹنے لگتا ہے۔اور جب مصرعہ ختم ہوتا ہے تو ہم بے اختیار پکار اٹھتے ہیں''جیو لالا''۔

چچا احسن خان تشریف لاتے ہیں اور سگریٹ سلگا کر چپ چاپ، سر جھکائے ایک کونے میں بیٹھ جاتے ہیں۔آپ عطا کے قریبی رشتہ دار ہیں۔موسیقی کے شستہ ذوق سخن فہمی اور داد کے منفرد انداز کی بناء پر میکدے میں سے نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔

ڈوھڑہ ختم ہوتے ہی لالا اسی دھن میں عدؔم کا یہ مطلع چھیڑ دیتا ہے ؎

جو بھی تیرے فقیر ہوتے ہیں

آدمی بے نظیر ہوتے ہیں

''او جیو عطا اللہ خان'۔۔۔۔جیو۔۔۔۔۔۔ہزاروں سال جیو۔۔۔۔۔ہا''۔

چچا احسن خان اچانک زانو پر ہاتھ مار کر اس قدر جوش وخروش سے یہ نعرہ لگاتے ہیں کہ ہم سہم کر رہ جاتے ہیں اور لالا ایک طویل الاپ کے بعد پھر یہی مطلع دہراتا ہے۔چچا احسن خان جھوم جھوم کر''جیو عطا اللہ خان'' جیو کے نعرے لگا رہے ہیں۔

لیجئے حضرت عقیل علیؔسی خیلوی بھی آ گئے۔سر پہ جناح کیپ، آنکھوں پر دبیز شیشے کی عینک، ہاتھ میں ٹارچ، بغل میں بید کی دو میٹر لمبی چھڑی۔خاصے معقول آدمی دکھائی دیتے ہیں۔السلام علیکم کہہ کر کمرے کی شمالی دیوار سے لگ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

''لالا غزل کا یہ مصرعہ اٹھاتا ہے:

وہ پرندے جو آنکھ رکھتے ہیں

عقیل علیٰسی خیلوی چونک کر آہ بھرتے ہیں اور تحت اللفظ اگلا مصرعہ پڑھ دیتے ہیں۔

سب سے پہلے اسیر ہوتے ہیں۔۔۔ واہ !

غزل ختم ہوتی ہے تو لالا ماسٹر وزیر سے مخاطب ہوتا ہے۔ ماسٹر!''

''ماسٹر ماجے کو بلاؤ۔''

ملازم حسین عرف ماجا دن میں گورنمنٹ ہائی سکول عیسیٰ خیل میں ملازمت کرتے ہیں اور رات بھر میکدے کی محفل میں طبلہ نوازی فرماتے ہیں۔

عقیل علیٰسی خیلوی سے ٹارچ اور چھڑی لے کر ماسٹر وزیر ماجے کی تلاش میں نکل جاتے ہیں۔

''سجنڑاں دی خیر۔'' یہ آواز نور محمد دیوانہ کی ہے (ہائے کس منہ سے اسے مرحوم کہوں)۔ عمر پچاس کے لگ بھگ آبنوسی رنگت، گٹھا ہوا توانا جسم، بھاری بھرکم گونج دار آواز، شخصیت سراپا خلوص، اس عمر میں عشق تو کیا کرتے ہوں گے، البتہ لالا سے محبت آغاز شباب کے عشق سے بھی دو چار قدم آگے ہے۔ آتے ہی لالا کو ایک فرشی سلام کر کے باادب، باملاحظہ، ہاتھ باندھے ایک طرف بیٹھ جاتے ہیں۔ داد عموماً ماہیے پر دیتے ہیں۔ انداز سب سے جدا ہے ''جیویں'' اس ادا سے کہتے ہیں کہ سامعین تڑپ اٹھتے ہیں طبلے کی تھاپ کے ساتھ ان کی تالی ایک سماں باندھ دیتی ہے۔۔۔۔۔۔ آہ اب تو دیوانہ کی یاد لالا کے بعض پرانے کیسٹوں میں ''جیویں'' کی آواز اور تالی کی گونج میں محدود ہو کے رہ گئی ہے۔

ہائے کیا شخص تھا؟ ہر سانس میں پیار کی مہک، ہر لفظ میں محبت کی مٹھاس، ہر لمحہ دوستوں کی خدمت پر کمربستہ۔ کسی تقریب میں جانا ہو تو لالا کا ہارمونیم سر پہ اٹھائے دیوانہ سب سے آگے چل رہا ہے۔ شائد اسی تیز رفتاری کے باعث وہ سب سے آگے نکل گیا۔

دور، بہت دور۔۔۔۔۔ اب تو نظر بھی نہیں آتا۔

وہ شام کبھی نہ بھلا سکوں گا، جب لالا، میں اور چند دوسرے دوست دیوانہ کو منانے اس کے گھر گئے تھے، قصہ یہ تھا کہ دیوانہ نہ جانے کس بات پر ہم سے روٹھ گیا تھا۔ دیوانہ کے بغیر محفل گذشتہ چند راتوں سے کچھ سُونی سُونی، اداس سی لگتی تھی (آہ! اب یہ محفل ہمیشہ سُونی رہے گی)۔

دیوانہ گھر میں موجود تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ گلوگیر آواز میں کہنے لگا۔

''آؤ سجنو! اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ تم لوگوں کو تو میں اپنے بچوں کے برابر سمجھتا ہوں۔ اپنے بچوں سے بھلا کوئی کب تک روٹھ سکتا ہے۔ آج نہیں تو کل خود بخود حاضر ہو جاتا''۔

کتنا چھوٹا شخص تھا۔ اب کی بار جو روٹھ کر گیا تو اتنی دور نکل گیا کہ قیامت سے پہلے ملنے کا امکان نہیں۔ کاش! قیامت کے دن دوسری عنایات کے علاوہ قدرت ہماری وہ محفلیں اور ان کے ساتھ نور محمد دیوانہ بھی ہمیں واپس لوٹا دے۔

غم روزگار کے ہاتھوں مجبور ہو کر پہلے لالا نے عیسیٰ خیل کی مستقل سکونت کو خیر باد کہا۔ پھر میرا تبادلہ عیسیٰ خیل سے میانوالی ہو گیا۔ بلکہ سچ پوچھئے تو تبادلہ میں نے خود کرایا۔ میکدہ کی ویرانی اور خم و ساغر کی اداسی دیکھی نہ جاتی تھی۔ محفل درہم برہم ہوئی تو دیوانہ اکیلا رہ گیا۔ تنہائی کہاں تک برداشت کرتا۔ ایک صبح عیسیٰ خیل کے ریلوے سٹیشن پر اپنے کوارٹر میں سب کچھ جوں کا توں چھوڑ کر اپنے خالق کے ہاں جا بسا۔

یہ لیجئے لالا یوسف خان بھی آ گئے۔ آپ نیشنل بینک کی مقامی برانچ میں منیجر ہیں۔ دراز قامت، وجیہہ شخصیت، باتوں میں خلوص کی خوشبو، عادات واطوار بے حد قلندرانہ، اتنی قلندرانہ کہ ذراسی بات پر بیس سال کی ملازمت اور چار پانچ ہزار روپے کی تنخواہ پر لعنت بھیجتے، مستعفی ہو کر گھر جا بیٹھے۔۔۔۔ یہ بعد کی بات ہے۔ آج رات آپ حسبِ معمول بنک ہی سے سیدھے میکدہ پہنچے ہیں۔ لالا یوسف خان ایک خاص انداز میں آنکھیں موند کر ہاتھ لہرا لہرا کر، جھوم جھوم کر داد دیتے ہیں۔ لالا کے شیدائیوں میں ان کا نام سرفہرست ہے۔ آندھی ہو یا بارش، ان کی حاضری کبھی خطا نہ ہوتی۔

قہقہے کی یہ جان دار آواز یقیناً چاچا نیازی کی ہے (بے حس موت' تجھے کیا کہوں۔ کیسے کیسے لوگ تو نے ہم سے چھین لئے)۔

چاچا محمد اسلم خان نیازی ذریعہ معاش کے اعتبار سے ڈرائیور تھے۔ مگر ڈرائیوروں والی کوئی خامی ان کی شخصیت میں کبھی نہ دیکھی۔۔ نہایت شریف النفس اور وضعدار بزرگ تھے۔ زندہ دل اس قدر کہ عمر کا تفاوت کبھی محسوس ہی نہ ہونے دیا۔ ہر وقت ہنستے ہنساتے رہنا ان کا معمول تھا۔ ایسا بھرپور قہقہہ لگاتے کہ در و دیوار بھی گونج اٹھتے۔

چاچا نیازی تلاش معاش میں سعودی عرب گئے۔ تو روح وہیں چھوڑ آئے۔ جسم کو ہم نے تابوت میں سجا کر سپردِ خاک کر دیا کہ اپنے کام کی چیز تو اب اس میں تھی ہی نہیں۔ لالا کا یہ معروف گیت ان کا محبوب گیت تھا۔

کر کر منتاں یار دیاں آخر آن جوانی ڈھلی

ہائے وہ رات، اگلی صبح چاچا نیازی نے سعودی عرب روانہ ہونا تھا۔ ان کی فرمائش پر (کسے معلوم تھا کہ یہ آخری فرمائش ہوگی) اس رات موسیقی کی ایک خصوصی محفل برپا ہوئی۔ اس محفل میں چاچا نیازی نے اپنی پسند کے کئی گیت عطاء کی آواز میں ریکارڈ کرائے۔ غالباً چار کیسٹ ریکارڈ ہوئے۔ دیارِ دورِ اُفتادہ میں یہی کیسٹ چاچا نیازی کی تنہائیوں کے ساتھی رہے۔ محفل برخاست ہوئی تو چاچا نیازی بڑے پیار سے ہم سب سے گلے مل کر رخصت ہوئے۔

ہر رات ٹھیک بارہ بجے لالا کے گھر سے چائے آتی، قربان جایئے اس ماں کی ممتا کے، جو اپنے لال کا اتنا خیال رکھتی ہے۔۔۔۔ عارضۂ قلب میں مبتلا ہونے کے باوجود امی جان نے میکدے کے رِندوں کو رات بارہ بجے کی چائے سے کبھی محروم نہ رکھا۔ عطاء کی خانہ آبادی تو ابھی دور کی بات تھی۔ اس لئے چائے، امی اپنے ہی نحیف ہاتھوں سے تیار کرتیں۔ اور چائے بھی پچیس تیس پیالے سے کم کبھی نہ ہوتی۔ آفرین ہے ان کی ہمت پر، اللہ تعالیٰ ان کے شفیق آنچل کا سایہ عطاء کے سر پر ہمیشہ قائم رکھے۔

ماں کی شفقتوں سے لبریز چائے کی حدت سے سامعین کے دل پگھل کر یوں موم ہوتے کہ ہر مصرعے پر آہ اور ہر شعر پر واہ کے شور سے میکدے کے در و دیوار گونج اٹھتے۔ اتنی بے پناہ داد پا کر لالا بھی یوں کھل کر گاتا کہ سردیوں کی سرو قامت سیاہ فام رات بھی رقص کرتی دکھائی دیتی۔

ہر رات ٹھیک دو بجے یہ محفل برخاست ہوتی اور لالا ایک دو مخصوص احباب کے ہمراہ کسی پراسرار منزل کی جانب چل دیتا۔ ایک مرتبہ ہم نے بھی ساتھ جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو لالا نے ہنس کر کہا ''ملک صاحب' آپ شریف آدمی ہیں' آپ ہمارے ''وہاں'' جا کر کیا کریں گے''۔

اس حوصلہ شکن جواب سے دل برداشتہ ہو کر ہم اپنی شرافت کے گلے میں بانہیں ڈال کر وہیں دری پر لمبی تان کر سو گئے۔

آٹھواں سر

اونچے سروں کی شاخوں میں اُلجھ کر جب یہ آواز کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑاتی ہے تو روح کا شجر جڑوں تک لرز اٹھتا ہے۔ اور پھر جب اس بلندی سے کسی زخمی پرندے ہی کی طرح یہ آواز ایک ہچکی کے ساتھ نیچے کو آتی ہے تو ہارمونیم پر عطا کی انگلیوں کی لرزش

رقصِ بسمل کا منظر بن جاتی ہے۔

یہ آواز وہ آواز ہے جو حلق کی کمان سے تیر کی طرح سنسنا کر نکلتی ہے اور تیر ہی کی طرح دل میں پیوست ہو جاتی ہے۔ بشرطیکہ دل کسی انسان کا ہو۔ اس آواز کو کوئی نام دینا چاہیں تو موسیقی کی لغت کی تنگی داماں کا بھرم کھلتا ہے کہ اتنی مؤثر اور مقبول آواز کے لیے کوئی لفظ سرے سے موجود ہی نہیں۔ شاید اسی لیے کہ ایسی کوئی آواز پہلے موجود ہی نہ تھی۔ یوں لگتا ہے کہ اس آواز کو تخلیق کر کے قدرت نے سات سروں کی کائنات میں ایک آٹھویں سر کا اضافہ کیا ہے۔ اور اس طرح یہ ثابت کر دیا ہے کہ سروں کا خالق انسان نہیں بلکہ وہ خالقِ عالم خود ہے۔

موسیقی بلاشبہ ایک فن ہے، مگر اس فن کے ذریعے مقبولیت حاصل کرنے کے لئے شرط فنی مہارت اور تکنیکی داؤ پیچ نہیں بلکہ آواز کا اثر ہے۔ جو سو فیصد ایک خداداد نعمت ہے۔

بڑے سے بڑا ماہرِ فن بھی اپنی خداداد آواز کو اپنی مرضی کے مطابق نہیں ڈھال سکتا۔ فنی مہارت اور کامیاب گلوکاری میں وہی فرق ہے جو موٹر سازی اور اچھی ڈرائیونگ میں ہے۔ ضروری نہیں کہ ایک اچھا مکینک ایک اچھا ڈرائیور بھی ثابت ہو۔

عطاء نے ماہرِ فن ہونے کا دعویٰ کبھی نہیں کیا، مگر ظلم تو یہ ہے کہ ماہرینِ فن اسے محض گلوکار ماننے پر بھی آمادہ نہیں۔ وہ تو شکر ہے اللہ کا کہ مقبول گلوکاری کی سند ماہرینِ فن کی بجائے عوام کے دائرۂ اختیار میں ہے، ورنہ پکے راگ کے سوا کوئی غنائیہ کاوش گلوکاری نہ کہلا سکتی۔ موسیقی کے فن میں مہارت اور مقبول گلوکاری کا فرق سمجھ میں آ جائے تو آپ یقیناً میری اس رائے سے سو فیصد اتفاق کریں گے کہ مقبولیت کے اعتبار سے یہ توانا آواز ہر جگہ سنائی دیتی ہے۔ اور صرف سنائی ہی نہیں دیتی بلکہ دل کو متاثر بھی کرتی ہے۔ کیونکہ عطاء کی آواز زبان یا الفاظ کی محتاج نہیں۔ سرائیکی اور پنجابی سے قطعاً نابلد لوگ بھی اس آواز کے مداح ہیں۔

کوئی دس سال ہوئے، میرے ایک شناسا نے ایک عجیب واقعہ سنایا۔ یہ صاحب کسبِ معاش کے سلسلے میں سعودیہ میں مقیم ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ایک شام میں اپنا روزمرہ کا کام ختم کر کے اپنے کیمپ میں واپس جا رہا تھا۔ میرے ہمراہ ہماری فرم کے دو امریکن انجینئر بھی تھے۔ راستے میں ایک جگہ پاکستانی بھائی کے چھپر نما ہوٹل میں عطاء کا ایک کیسٹ با آواز بلند بج رہا تھا۔ میرے قدم بے اختیار رک گئے اور میں ماہیے کے دلگداز بولوں میں کھو کر رہ گیا۔ اچانک نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ دونوں امریکی انجینئر بھی کھڑے اس آواز پر سر دھن

رہے تھے۔ میں بے حد حیران ہوا کہ میں تو اپنی مادری زبان کے سحر میں گرفتار ہوں مگر ان حضرات پر اس آواز نے یہ کیسا جادو کر دیا۔ ان سے اس محویت کی وجہ پوچھی تو ایک صاحب نے آہ بھر کر کہا

‘‘This voice makes me feel nostalgic.’’

یعنی یہ آواز سن کر مجھے گھر کی یاد ستا رہی ہے۔۔۔۔اور پھر فوراً ہوٹل میں جا کر انہوں نے منہ مانگے داموں وہ کیسٹ خرید لیا۔

اسی قسم کا ایک واقعہ عطاء نے اس زمانے میں بتایا کہ جب وہ اسلام آباد میں مقیم تھا۔ عطاء کا کہنا ہے کہ ایک دن میں ایک دوست کے ہمراہ اسلام آباد کے ایک بڑے ہوٹل میں بیٹھا تھا۔ کچھ دور سامنے ایک میز پر ایک غیر ملکی خاتون ایک معمر پاکستانی گائیڈ کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ کچھ دیر ٹکٹکی باندھ کر مسلسل میری طرف دیکھتی رہیں، پھر گائیڈ سے کچھ کہا اور وہ صاحب اٹھ کر ہماری میز کے پاس آئے، اور کہنے لگے۔

’’معاف کیجئے گا‘ کیا آپ عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی ہیں؟‘‘

’’جی ہاں!‘ میں نے کہا‘ کیا خدمت کروں آپ کی؟‘‘

’’شکریہ‘ انہوں نے کہا’’ دراصل بات یہ ہے کہ میرے ساتھ جو خاتون بیٹھی ہیں ایک فرانسیسی اخبار کی نامہ نگار ہیں۔ انہوں نے خدا جانے کیسے آپ کو پہچان لیا۔ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ ہم احتراماً اُٹھ کر ان کی میز پر جا بیٹھے۔ خاتون نے انگریزی میں اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ ایک فرانسیسی اخبار سے وابستہ ہیں اور کچھ عرصہ سے پاکستان میں مقیم ہیں۔ یہاں کی جو چیزیں انہیں پسند ہیں ان میں ایک میری آواز بھی ہے۔ ہم ان سے یہ سن کر حیران رہ گئے‘ کہ ان کے پاس میرے سب کیسٹ موجود ہیں۔ جو بھی نیا کیسٹ بازار میں آتا فی الفور خرید لیتی ہیں۔

ہم نے کہا’’ محترمہ! کیا آپ ہماری زبان سمجھ لیتی ہیں؟‘‘

کہنے لگیں:

‘‘No I just get the impression but its so lovely.....’’

عطاء کی آواز کے بارے میں ایک حیران کن بات ریڈیو پاکستان ملتان کے سارنگی نواز محمد حسین نے بتائی۔ چند سال قبل وہ عطاء کے ہمراہ ایک محفل موسیقی کے سلسلے میں عیسیٰ خیل آئے تو برسبیلِ تذکرہ انہوں نے بتایا کہ سارنگی کا سب سے اہم تار چمڑے کا تانت ہوتا ہے۔ مگر عطا کی آواز میں نہ جانے کیا بات ہے کہ چمڑے کا تانت ان کی آواز کا ساتھ نہیں

دے سکتا۔ ایک آدھ مرتبہ ان کے ساتھ سنگت کا اتفاق ہوا تو یہ پتہ چلا کہ چمڑے کے تانت سے وہ تاثر پیدا نہیں ہوتا جو ہونا چاہیئے۔ لہٰذا ان کے ساتھ سنگت کے لئے میں سٹیل کا تار استعمال کرتا ہوں اور سٹیل کے تار سے انگلیوں کو زخمی ہونے سے بچانے کے لئے ان پر پلاسٹر ٹیپ لپیٹ لیتا ہوں۔ ریڈیو کی ملازمت کے طفیل میں پاکستان کے ہر بڑے گلوکار کے ساتھ سارنگی پر سنگت کا اعزاز بارہا حاصل کر چکا ہوں اور ہمیشہ چمڑے کا تانت ہی کام دیتا رہا، مگر عطاء کی آواز میں خدا جانے کیا بات ہے کہ صرف سٹیل کا تار ہی اس آواز کا ساتھ دے سکتا ہے۔

اکثر لوگ عطاء کی آواز کے سوز کو اس کی ذات سے وابستہ سکینڈلز کا عطیہ سمجھتے ہیں۔ میں نا تو ان سکینڈلز کی تردید کروں گا' نہ ہی آواز پر غمِ جاناں کے اثر کا منکر ہوں۔ مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ عطاء کی آواز کا اثر صرف اور صرف عطائے جاناں نہیں بلکہ اس میں اور بھی کئی عناصر شامل ہیں' جن میں سرفہرست تو اللہ کی بے پایاں عنایت ہے۔ اس حقیقت سے کوئی کافر بھی انکار نہیں کر سکے گا کہ آواز اور اس کا اثر انسان کی تخلیق ہرگز نہیں۔ اگر تخلیق کی یہ قدرت انسان کے پاس ہوتی تو آج ہر فرد امانت علی خان، مہدی حسن، غلام علی اور عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی ہوتا۔ اور خواتین سب کی سب ملکۂ ترنم ہوتیں۔ لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ آواز مہدی حسن کی ہو یا عطاء کی اللہ کی ہی دین ہے۔ اور ہر آواز کا مخصوص اثر بھی اُسی خالقِ اکبر کی تخلیق ہے۔ اور یہ کہنا بھی غلط نہ ہو گا کہ ہر مترنم آواز کے اثر کی تربیت کر کے اسے درجہ کمال تک پہنچانے کے لئے مناسب حالات، واقعات، سانحے اور حادثات بھی وہ خود فراہم کرتا ہے۔ یعنی عطاء غمِ جاناں اور غمِ دوراں کے جتنے بھی صدمات سے گذرا وہ سب کے سب قدرت ہی کے ایک عظیم منصوبے کا حصہ تھے۔

کون انہیں سمجھائے؟

عطاء کی بے پناہ مقبولیت سے حسد کرنے والوں کی بھی کمی نہیں اور وہ لوگ موقع بے موقع بظاہر نہایت غیر جانبداری سے عطاء کے خلاف زہر اگلتے رہتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ ''صاحب! آواز کا کیا ہے۔ کب تک ساتھ دے گی۔ یہی دو چار سال کا عروج ہے پھر زوال ہی زوال۔ آج اس کی شہرت چار سو پھیلی ہوئی ہے، کل کوئی اور اس کی جگہ لے لے گا''۔

ان کرم فرماؤں کو کون یہ سمجھائے کہ حضرات یہ آواز آپ کی عطا کردہ نہیں بلکہ اس

ربِ کریم کی عنایت ہے جس کی عنایات پائیداری میں اپنا جواب نہیں رکھتیں اگر محمد رفیع کی آواز پورے چالیس سال آوازوں کی دنیا پر حکمرانی کر سکتی ہے تو کیا عطاء کی آواز کو یہ اعزاز عطاء نہیں ہو سکتا؟ دینے والے کے فیصلوں کی آپ کو کیا خبر؟

کچھ حضرات کہتے ہیں ''بھئی پتہ نہیں اس شخص نے کیا فراڈ چلا رکھا ہے، کہ جہاں جاؤ اسی کی آواز کان میں پڑتی ہے۔ جہاں بیٹھو اسی کے تذکرے چھڑے ہیں۔ سُر نہ ساز، پوری قوم کو اُلو بنا رکھا ہے۔۔۔ اس کے مقابلے میں اپنے چھجو میاں کو دیکھئے۔ گلے میں رس، سا، رے، گا پر مکمل عبور، مرکیاں، گمک، تان، پلٹے سب کچھ از بر، شکل وصورت میں کون سے فلمی ہیرو سے کم ہیں۔ ریڈیو، ٹی وی پر برابر دس سال سے گا رہے ہیں، مگر انہیں کوئی گھاس تک نہیں ڈالتا۔ کسی گھر میں ان کا ایک بھی کیسٹ آج تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ اوپر نیچے چار کیسٹ تو پچھلے مہینے مارکیٹ میں آئے تھے۔ مگر میوزک سینٹر والے کہتے ہیں قسم لے لو جو دس کیسٹ بھی بکے ہوں۔۔۔ آخر ہماری قوم کو ہو کیا گیا ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ عطاء اللہ نے لوگوں پر کیسا جادو کر دیا ہے۔ کون سی دکھتی رگ پکڑ رکھی ہے ان کی۔۔۔ ایسی کون سی انوکھی بات ہے اس کی گلوکاری میں۔۔۔؟

کوئی اور انوکھی بات عطا کی گلوکاری میں ہو نہ ہو۔ یہی کیا کم ہے کہ یہ صاحب حلقہ یاراں میں گرج برس کر جب گھر جاتے ہیں تو گھر میں قدم رکھتے ہی عطاء کی آواز کان میں پڑتی ہے۔

اے　　نتھلی　　،　　نک　　دی　　نتھلی

تیڈی وینٹی ہے گوری پتلی تے ونگاں نال چھنکدیاں

اور ان کے بیوی بچے ٹیپ ریکارڈ کے گرد گھیرا باندھے نہایت انہماک سے عطاء کی آواز سن رہے ہوتے ہیں۔

عطاء کی آواز وہ آواز ہے جس کے اثر کو گا، ما، پا، دھا، نی کے پیمانے سے نہیں ماپا جا سکتا۔ اس کی بے پناہ مقبولیت بلاوجہ نہیں ہے۔ یہ آواز وہ اکلوتی آواز ہے جو ہر غم زدہ دل میں تیر کی طرح اترتی ہے اور خون میں سرایت کر کے پورے وجود میں تیرتی ہوئی انسان کے اندرونی زخموں کو کچھ اس طرح کریدتی ہے کہ تمام کرب اور اذیت، دکھ اور درد یا تو اشکوں میں ڈھل کر آنکھوں کے راستے زائل ہو جاتا ہے، یا پھر ایک کیف آور غبار بن کر درد سے چٹختے اعصاب کو سکون کی نیند سلا دیتی ہے۔ زخم جواں سال بیٹے کی جدائی کا ہو، یا ماں باپ سے ہمیشہ کے لئے بچھڑنے کا، دکھ محبوب کی بے وقت موت کا ہو یا وطن سے دوری کا۔ رنج کسی ضعیف العمر انسان کو اپنی بے بسی کا ہو یا کسی بچے کو اپنا کھلونا ٹوٹنے کا، عطاء کی آواز ہر زخم، ہر دکھ

اور ہر رنج سے ہمکلام ہوتی ہے۔

ساز

اساتذۂ فن کی نظر میں ہارمونیم ایک نہایت گھٹیا ساز ہے۔ آج سے کچھ عرصہ قبل ریڈیو کے ارباب اختیار ریڈیو پر ہامونیم کے ساتھ گانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ یہی ہارمونیم کبھی عطاء کو بجاتا سنیئے تو آپ دنگ رہ جائیں گے۔ عام گلوکاروں کی طرح وہ محض مقررہ سروں پر انگلیاں پھیر کر رسم پوری نہیں کرتا، بلکہ اپنے گیت، ڈوھڑے یا ماہئے کا ایک ایک لفظ ان سروں سے کشید کرتا ہے۔ اور گیت یا ماہئے کے ہر مصرعے کے آخر میں ہارمونیم کا ایک ایسا انوکھا چ دیتا ہے کہ بول کا المیہ یا طربیہ تاثر شعور کی جھیل میں چاند کی طرح اُتر جاتا ہے۔

سرائیکی اور اردو زبان کی شیرینی اپنی جگہ، مگر سروں میں ڈھل کر، بالخصوص اونچے سروں میں گانے کے دوران تلفظ گلوکار کی گرفت سے پھسلنے لگتا ہے اور لہجے میں ایک ناگوار سی کرختگی در آتی ہے۔ عطاء نے مسلسل محنت سے ایک ایسا لہجہ اپنا لیا ہے جس میں شرینی اور اداسی کا ایک حسین امتزاج سننے والوں کو اپنی روح میں گھلتا محسوس ہوتا ہے۔

اندازِ بیاں اور

اردو میں سرائیکی اور سرائیکی میں اردو کا پیوند لگانے کی بدعت بھی عطاء ہی کی ایجاد ہے۔ اور یہ بدعت بھی اس کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب ہے۔ فیض کے کلام میں آڈھے خان کا ڈوھڑہ وہ اس طرح ملاتا ہے کہ تھل کے اَن پڑھ دہقان پر بھی فیض کے شعر کا مفہوم پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یونس خان کے سرائیکی گیت میں وہ جگر مرادآبادی کا شعر اس لئے شامل کر دیتا ہے کہ سرائیکی نہ سمجھنے والے اہلِ ذوق بھی یونس خان کی بات بخوبی سمجھ لیتے ہیں۔

جوگ، بھیرویں، پہاڑی اور سندھڑا وغیرہ میں ڈوھڑہ اور ماہیا گانے کا انداز جو عطا کا ہے کسی اور کا نہیں۔ اس منفرد اور دلکش انداز کی نقل اگر کوئی کر بھی لے تو عطاء ہی کا خوشہ چین کہلائے گا۔

عطاء کو ایک بڑا گلوکار مانیں یا نہ مانیں اس کا یہی کمال کیا کم ہے کہ اس نے ہلکی پھلکی

موسیقی کو اس وقت سنبھالا دیا جب لوگ بے ہنگم، فحش اور کرخت فلمی گیتوں سے بیزار ہو کر گیت کے نام سے کوئی چیز سننے کو آمادہ ہی نہیں ہوتے تھے۔ گلوکاروں نے جب سامعین کے چہروں پر بیزاری کے تیور دیکھے تو ان کی توجہ حاصل کرنے کے لئے گانے کے ساتھ ساتھ بھونڈے انداز میں ناچنا اور تھرکنا بھی شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مظلوم عوام نے فلموں، ٹیلی وژن اور ریڈیو کی راہ سے ہلکی پھلکی موسیقی کے عنوان سے پھیلتے تعفن کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ شرفاء نے فلمیں دیکھنا چھوڑ دیا۔ فلمی گانوں کی موسلا دھار بارش کے خوف سے ریڈیو کا سوئچ صرف خبریں سننے کے لئے آن (On) کیا جاتا اور خبریں ختم ہوتے ہی لاحول پڑھ کر فی الفور بند کر دیا جاتا۔

یہ تھی ہلکی پھلکی موسیقی کی قدر و قیمت جب عطاء اس میدان میں وارد ہوا۔ مگر آپ نے دیکھا کہ وہ آتے ہی نہ صرف سب کا منظورِ نظر بن گیا بلکہ بے شمار لوک گلوکاروں اور گیت نگاروں پر بھی شہرت اور مقبولیت کے دروازے وا کر دیئے۔ لوک گلوکاری کو جو عروج عطاء کے آنے سے حاصل ہوا اس کی مثال موسیقی کی تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتی۔

منصور علی ملنگی، طالب حسین دردؔ، بشیر احمد، اللہ دتہ لونے والے، محمد حسین بندیالوی، احمد خان ملنگ، شفیع اختر دتہ جیلوی، ایوب نیازی، لیاقت علی خان، عبدالستار زخمی وغیرہ نے ملتان، جھنگ، بہاولپور، ساہیوال، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسمٰعیل خان، مظفر گڑھ، میانوالی، اٹک، سرگودھا، خوشاب، چکوال، راولپنڈی اور جہلم کے علاقوں میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ ڈوھڑے کی صنف میں ریاض، اقبال، تاج یاسین، آڈھا خان، بے وس وغیرہ نے نہایت خوبصورت شاعری تخلیق کی، سینکڑوں گیت نگار منظر عام پر آئے، اور اس طرح عطاء کے دم سے مقبول موسیقی کی ایک رنگا رنگ دنیا آباد ہو گئی جس میں،

جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

لوک گلوکاروں کی روز بروز بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھ کر ٹیلی وژن کے ارباب اختیار بھی ان لوگوں کی اہمیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے اور ان کے خصوصی شو نشر ہونے لگے۔ عوام کے مزاج شناس، ان کے دکھوں کے ترجمان، ان کی خوشیوں کو دوبالا کرنے والے فنکار جنہیں محض ان کی غریبی کی وجہ سے ٹیلی وژن سٹیشنوں کے قریب سے گزرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ اب انہیں گھروں سے بلا کر ٹیلی ویژن پر اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کی دعوتیں دی جانے لگیں لوک گلوکاری کی مقبولیت نے محمد علی شہکی جیسے فیشن ایبل پاپ سنگر کو بھی علن فقیر جیسے بوریہ نشین لوک گلوکار کے ساتھ مل کر لوک رنگ میں گیت گانے پر آمادہ کر لیا۔۔۔۔ آپ خود ہی انصاف کیجئے کہ لوک گلوکاری

کی اس مقبولیت کا سہرا کس کے سر ہے؟۔۔۔۔بے شک لوک موسیقی کی نوک پلک سنوارنے میں اور لوگوں نے قابلِ قدر کردار ادا کیا ہے۔بہت بڑے بڑے نام اس شعبے سے وابستہ ہیں۔یہاں یہ نام اس ڈر سے درج نہیں کرتا کہ اگر کوئی نام سہواً رہ گیا تو اس نام کے پرستاروں کی گالیاں سننا پڑیں گی۔لہٰذا یہ کہوں گا کہ لوک موسیقی کے میدان میں بڑے بڑے باکمال لوگ موجود ہیں مگر لوک موسیقی کو مقبولِ خاص و عام بنانے کا کمال عطاء کی آواز نے دکھایا۔

دل نے بہت درد سہے

فن کی خاطر مصائب تو ہر فنکار برداشت کرتا ہے مگر حوصلہ شکنی اور بے قدری کے جن تلخ تجربوں سے عطاء گزرا ہے ان کا تصور ہی لرزہ خیز ہے۔فن سے محبت کے جرم کی پاداش میں اس کو کیا کیا سزائیں نہ دی گئیں۔وہ کراچی میں فٹ پاتھوں پر سویا، لاہور کے ہوٹلوں میں ملازمت کی، فیصل آباد میں رکشہ ڈرائیوری کی، مگر فن کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔۔۔۔ایک دفعہ اس کے ہمراہ فیصل آباد کے ایک بازار سے گزر ہوا تو عطاء نے ایک بوسیدہ سی عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''لالا آج سے دس برس پہلے میں اس عمارت کے ایک تنگ و تاریک کمرے میں مقیم تھا''۔

''وہ کس جرم میں؟'' میں نے پوچھا

عطا کی آواز بھرا گئی کہنے لگا'' یہاں حبیب بینک میں ایک کلرک کی آسامی کے لئے درخواست دے رکھی تھی۔میں تیس روپے ماہوار کرایہ پر اس کوٹھری میں رہتا تھا۔دن بھر رکشہ چلا کر کھانے پینے اور کرائے کا خرچ پورا کرتا رہا۔تین ماہ کے مسلسل انتظار کے باوجود ملازمت نہ مل سکی۔''

''اچھا۔تو پھر کیا ہوا؟''

''پھر یہ ہوا کہ میرے گھر والوں کو میرے ٹھکانے کا پتہ چل گیا، اور والد صاحب یہاں آ کر مجھے اپنے ہمراہ گھر لے گئے۔''

اللہ تعالیٰ کی شان دیکھئے کہ آج اسی فیصل آباد میں جہاں کلرک کی جگہ نہ مل سکی۔ جہاں وہ پرائے رکشے پر مزدوری کرتا رہا عطاء جب اپنی لمبی چوڑی قیمتی گاڑی کہیں روکتا ہے تو لوگ پروانوں کی طرح اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔

عیسیٰ خیل جیسی سنسان جگہ پر جسے تہذیبی اعتبار سے ایک دور افتادہ جزیرہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا، محض اپنے ذوق کو زندہ رکھنا ہی کچھ کم کمال نہیں۔۔۔۔تربیت اور رہنمائی تو دور کی بات ہے، حوصلہ افزائی کی توفیق بھی کسی کو نصیب نہیں۔ پسماندگی اور بے سروسامانی کے احساس میں مبتلا لوگ یہ تصور ہی نہیں کر سکتے کہ عزم اور محنت کی مدد سے کوئی شخص کسی میدان میں درجہ کمال کو پہنچ سکتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی باہمت انسان آگے بڑھنے کے ارادے کا اظہار بھی کرے تو اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ اسے خبطی اور پاگل کہا جاتا ہے۔ عطاء کو بھی یہ سب کچھ کہا گیا۔ اس کی محنت کو وقت کا ضیاع اور اس کے شوق کو تساہل پسندی قرار دیا گیا۔ اس کی جستجو کو آوارگی اور جدوجہد کو حماقت کا نام دیا گیا۔ مگر عطاء اپنی منزل متعین کر چکا تھا۔ اور سفر کے لئے زادِ راہ۔۔۔۔شوق، صلاحیت، محنت کی عادت اور راستے کی رکاوٹوں کو خاطر میں نہ لانے کی ہمت۔۔۔۔سے قدرت نے اسے اس حد تک نوازا تھا کہ وہ کسی کی حوصلہ افزائی کا محتاج، سرپرستی کا دست نگر اور رہنمائی کا حاجت مند نہ تھا۔۔۔۔نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔

وہ اللہ کے بھروسے اور اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ سفر مشکل بھی تھا اور طویل بھی۔۔۔۔اندازہ کیجئے کہ عطاء نے تقریباً بارہ سال ایک تنگ و تاریک کمرے میں بیٹھ کر اپنے فن کی تہذیب و تربیت کی۔ اپنی آواز پر محنت کی اور اپنا ایک مخصوص انداز وضع کیا۔ بارہ سال کے اس طویل بامشقت دور میں اس کا تعارف اس تنگ و تاریک کمرے کی چاردیواری تک محدود رہا۔ اس کے فن کے قدردان اور اس کی محنت کی داد دینے والے اسی جیسے چند تہی دست بے سروسامان اور گمنام نوجوان تھے جو ''جیولالا'' کہہ کر داد دینے کے علاوہ اس کی کچھ اور مدد کرنے کی استطاعت سے محروم تھے۔۔۔۔عطاء کی قناعت دیکھئے کہ وہ ''جیولالا'' کی اس بے ساختہ صدا ہی کو اپنے لئے سب سے بڑا اعزاز سمجھتا تھا۔ محفل میں اگر کوئی دوست کسی ذاتی پریشانی کی وجہ سے خاموش نظر آتا تو عطاء اس سے ''جیولالا'' کہلوا کر ہی دم لیتا۔

ایک رات شدید سردی اور بارش کی وجہ سے میرے سوا کوئی بھی دوست میکدے میں حاضر نہ ہو سکا۔ عطاء نے معمول کے مطابق گانا شروع کیا۔ میں خدا جانے کس عالم میں کھویا ہوا تھا کہ سر جھکائے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ عطاء کو میری خلافِ معمول خاموشی اچھی نہ لگی۔ میری پسند کا ماہیا۔

گل ساڈے اجڑن دی کدی ماہی وی سن باہسی

اونچے سروں میں الاپ کر دیکھا۔ کچھ اثر نہ ہوا۔ ایک بار پھر یہ ماہیا نئے انداز میں

پیش کیا، مگر ہماری توجہ ہمارے پاس ہوتی تو ادھر صرف کرتے۔ عطاء نے تڑاخ سے ہارمونیم بند کیا اور منہ پھلا کر بیٹھ گیا۔ اچانک خاموشی نے ہمیں جھنجوڑ کر چونکا دیا۔

''کیوں لالا، کیا بات ہے؟'' ہم نے بڑے تعجب سے پوچھا'' گانا کیوں بند کر دیا؟''

''دیکھو لالا'' عطاء نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا'' تم جانتے ہو کہ میں کسی صلے یا انعام کے لئے نہیں گاتا۔ صرف تم لوگوں کی خوشی کے لئے گاتا ہوں۔۔۔۔ اس لئے میری یہ گذارش بے جا نہ ہوگی کہ یا تو یہاں آنا ہی چھوڑ دو، یا پھر پوری توجہ سے مجھے سنا کرو اور مجھے یہ احساس ضرور دلاتے رہا کرو کہ میری محنت فضول اور بے اثر نہیں۔ بلکہ کارآمد اور مئوثر ہے،،

''جیو لالا'' ہم نے دل کی گہرائیوں سے نعرہ لگایا اور عطا نے مسکرا کر کھٹاک سے ہارمونیم کی چٹخنی کھولی اور پانچویں کالے سر سے جوگ میں وہی ماہیا ہماری نظر کر کے گانا دوبارہ شروع کر دیا۔

تقریبات میں عطاء کو گاتے دیکھیں تو کئی ایسی باتیں سامنے آتی ہیں جو اسے دوسرے فنکاروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ ایک تو اس کی بے پناہ خود اعتمادی ہے۔ مجمع جتنا بھی بڑا ہو، جس قبیل کا بھی ہو عطاء پر گھبراہٹ کبھی طاری نہیں ہوتی۔۔۔۔ خالص اہلِ ذوق کی مجلس ہو یا سینما ہال میں اگلی نشستوں پر بیٹھنے والی ستم ظریف مخلوق کا اجتماع، عطاء کے لئے اپنے فن کا مظاہرہ کرنا کبھی مسئلہ نہیں بنا۔ بظاہر ہارمونیم کے سروں سے کھیلتی ہوئی اس کی انگلیاں محفل کے ہر فرد کو اپنی نبض پر رکھی محسوس ہوتی ہیں، اس کے گیتوں کی لے اپنی رگوں میں دوڑتی محسوس ہوتی ہے، اور اُس کی آواز کا اُتار چڑھاؤ دلوں کے دھڑکنے کی رفتار متعین کرتا ہے۔

نغمہ سرائی کے دوران محفل کو ہمہ تن متوجہ رکھنے کے لئے عطاء اشعار کے علاوہ بعض اوقات ایک آدھ خوبصورت جملہ نشانے پر پھینک کر سب کی توجہ حاصل کر لیتا ہے۔ اور یوں اپنی بے نظیر گلوکاری کے علاوہ اپنی حاضر جوابی اور برجستہ گوئی کی داد بھی سامعین پر قرض نہیں رہنے دیتا۔

میکدہ

میکدہ کا ذکر اس داستان میں بار بار ہوا ہے۔ اس ذکر سے آپ کا یہ اندازہ تو درست ہے کہ میکدہ وہ کمرہ ہے، جہاں ہر رات ہماری محفل برپا ہوتی تھی۔ مگر یہ سراسر غلط ہوگا کہ وہاں اور

کرتوتوں کے علاوہ پینے پلانے کا کاروبار بھی ہوتا ہوگا۔ جی نہیں، میکدہ کی وجہ تسمیہ مے خواری نہیں بلکہ صرف خواری تھی۔ غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا حاصل خواری، جس سے پناہ لینے کے لئے ہم لوگ سرِ شام ہی وہاں جمع ہو جاتے تھے۔ اور سروں سے کشید کی ہوئی مے سے غم غلط کرتے تھے۔

میکدہ ایک وسیع و عریض چار دیواری سے گھرے ہوئے تین کمروں کی قطار میں درمیانی کمرہ تھا، اس کے بائیں جانب والے چھوٹے سے پر اسرار کمرے میں عطا کے ایک دو قریب ترین احباب کے سوا کسی اور کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ اس کمرے کی آرائش عطاء کی نفاستِ طبع اور خوش ذوقی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ کمرے میں حسبِ ضرورت فرنیچر اور زیبائشی چیزوں کے علاوہ عطاء کا ہارمونیم، ہررات کی محفل کے ریکارڈ شدہ کیسٹ اور کبھی کبھار ساقی گیری کے چند لوازمات سلیقے سے رکھے ملتے تھے۔ اس زمانے میں عطاء کو

شوق پینے کا اتنا زیادہ نہ تھا

بلکہ ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ اس نے پینا بالکل ہی چھوڑ دیا اور اگر وہ عیسیٰ خیل ہی میں رہتا تو

ترکِ توبہ کا کوئی ارادہ نہ تھا

مگر عیسیٰ خیل کے خشک اور بے ذائقہ ماحول سے نکل کر چراغ خانہ سے شمع انجمن بنا تو بعض مخلص اور خیر خواہ دوستوں کے فیض صحبت سے پینا پلانا معمول بن گیا۔ اور وہ مخلص اور خیر خواہ احباب بھی فائدے میں رہے کہ ان کا پینے پلانے کا خرچ عطاء کی جیب سے برآمد ہونے لگا۔

اللہ کا خصوصی کرم ہے کہ ایک طویل عرصے تک عطاء کی صحبت میں رہنے کے باوجود پینے پلانے کے معاملے میں ہم زاہد خشک ہی رہے۔ ایک دفعہ میکدے میں میں، عطاء اور اُن کے میانوالی سے آئے ہوئے دوست یونس خان شام کا کھانا کھا رہے تھے۔ یونس خان ولائتی وہسکی کی دو قد آور بوتلیں ہمراہ لائے تھے۔ دستر خوان پر اور چیزوں کے علاوہ دو گلاس وہسکی کے اور ایک سادہ پانی کا بھی رکھا تھا۔ از راہِ شرارت ہم نے وہسکی کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو عطاء نے فوراً جھپٹ کر گلاس ہمارے ہاتھ سے چھین لیا کہنے لگا۔

''لالا! ہم تو پینے کی ذلت آمیز عادت میں مبتلا ہیں، مگر تم ایک استاد ہو، تمہیں اس گھٹیا چیز کو ہاتھ لگانا ہرگز زیب نہیں دیتا۔''

اسی قسم کا ایک واقعہ حال ہی میں ایک تقریب کے موقع پر میانوالی میں ہوا۔۔۔

تقریب سے کچھ دیر پہلے بوتل کھلی تو کمرے میں موجود بیشتر احباب کے چہروں پر رونق آ گئی۔

ایک صاحب نے عطاء سے کہا ''آج ملک کو بھی پلاؤ۔۔۔کیا یاد کرے گا ساری عمر رندوں میں کٹ گئی، مگر۔۔۔''

رہنے دو۔۔۔۔یہ نہیں پیتا'' عطاء نے ان صاحب کو ڈانٹ دیا۔

''مگر کیوں نہیں پیتا؟'' اُن صاحب نے شوخی سے کہا۔

''اسی لئے تو ہم اس شخص کا احترام کرتے ہیں'' جناب فاروق روکھڑی نے منہ توڑ جواب دیا۔

بات میکدے کی ہو رہی تھی۔ کیوں نہ آپ کو وہیں لے چلوں، تا کہ آپ کو میکدہ اور اہلِ میکدہ کے بارے میں مزید کچھ جاننے کے لئے کسی اور واقفِ حال کی خدمات حاصل نہ کرنی پڑیں۔

آج کچھ درد مرے دل میں۔۔۔

آندھی ہو یا طوفان، کڑاکے کی سردی ہو یا غضب کی گرمی، میکدہ ہر شام آٹھ بجے آباد ہو جاتا۔ اور یہ آبادی صبح دو بجے تک بلا ناغہ برقرار رہتی۔۔۔دسمبر کی طویل، یخ بستہ راتوں کے پچھلے پہر جوگ کے سوگوار سروں میں یہ ماہیا فضا میں لہراتا:

پانی پیون ڈے
وسدیاں نئیو بھاندا ہن اجڑ کے جیون ڈے

تو تمام کائنات سیاہ لبادے میں، بال بکھرائے ٹوٹی قبر پر بیٹھی حسینہ کی طرح کرب سے کوکتی سنائی دیتی۔۔۔یہ جگر گداز ماہیا شکیب جلالی مرحوم کے اس شعر کا کس قدر خوبصورت ترجمہ ہے:

تو نے کہا نہ تھا کہ میں کشتی پہ بار ہوں
آنکھوں کو اب نہ ڈھانپ مجھے ڈوبتے بھی دیکھ

بلکہ ترجمہ کہنا بھی سو فیصد درست نہ ہوگا۔ اس ماہیے میں بات زیادہ درد انگیز انداز میں کہی گئی ہے۔

دسمبر کی وہ ناقابلِ فراموش رات جب کوئی بارہ بجے تک انتہائی اونچوں سروں میں ماہیا سرائی کرتے کرتے عطاء ایک چیخ مار کر ہارمونیم پر ڈھیر ہو گیا۔۔۔جسم شل، اکھڑتے سانس، ڈوبتی نبضیں۔۔۔موقع پر صرف میں اور ماسٹر وزیر موجود تھے۔۔۔شدید

سردی اور چھاجوں برستی بارش کی پروانہ کرتے ہوئے ہم دونوں سرپٹ بھاگے ایک ڈسپنسر دوست (لالا شنو) کے گھر پہنچے۔۔۔۔ہانپتے، کانپتے ہکلاتے ہوئے اسے اپنی بے وقت آمد کا سبب بتلایا اور اسے ہمراہ لے کر واپس میکدہ میں آئے تو عطا کی بے ہوشی مایوس کن صورت اختیار کر چکی تھی، اس کی حالت کو دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا تھا۔۔۔۔۔ڈسپنسر دوست نے عطاء کی نبض پر ہاتھ رکھ کر نفی میں سر ہلایا تو ہم دونوں بے اختیار چیخ اٹھے ''اے رب کریم' ہمارا لالا ہم سے نہ چھین۔۔۔۔تو جانتا ہے کہ اس شخص کا وجود غمزدہ دلوں کے لئے کتنا بڑا سہارا ہے۔''

رب رحیم کی رحمت رات کے پچھلے پہریوں بھی جوش میں ہوتی ہے۔ ہماری بے ساختہ التجا کام کر گئی۔ دعا کا جواب فوراً آیا۔ عطاء نے ایک جھرجھری سی لی اور آنکھیں کھول دیں۔ چند ہی منٹ بعد وہ یوں اٹھ کر بیٹھ گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔۔۔۔تشکر اور اطمینان کا سانس تو ہم نے لیا۔ مگر ایک انجانے خوف کی وجہ سے رات بھر عطاء کو دوبارہ ہامونیم کے قریب نہ جانے دیا۔۔۔۔یہ جبری پرہیز مگر کب تک کرواتے۔۔۔۔اگلی رات یہ حضرت پہلے سے بھی زیادہ اونچے سروں میں اپنی حسرتوں کا ماتم کر رہے تھے۔ اور ہم ہر مصرعے پر جیو لالا کے نعرے لگا رہے تھے۔

سکوت سخن شناس عطاء کسی صورت بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ میکدے کی محفلوں میں اگر کبھی کوئی دوست خلافِ معمول چپ چاپ اور پریشان دکھائی دیتا، تو عطاء فوراً ایک آدھ ماہیا یا شعر اس کی نظر کر کے اسے متوجہ کر لیتا۔ اسے ہر دوست کی پسند ناپسند کا علم تھا۔ اور اسی کے حوالے سے وہ ہر دوست کی فرمائش بن کہے پوری کر دیتا تھا۔ مثلاً مجھے متوجہ کرنے کے لیے وہ یہ ماہیا ضرور سناتا:

وکن املوک آیا
انج برباد کیتی، ساکوں ڈیکھن لوک آیا

ماسٹر وزیر سے بھرپور داد اس ماہیے پر ملتی:

قد ماہیۓ دا چھوٹا اے
کالیاں زلفاں دے وچہ مکھ چن دا ٹوٹا اے

چاچا احسن خان صاحب سے خراجِ تحسین اس شعر پر وصول ہوتا:

زندگی کے حسین ترکش میں
کتنے بے رحم تیر ہوتے ہیں

اس حد تک تو عطا اپنے سامعین کی پسند ناپسند کا خیال رکھتا تھا، مگر ہر رات وہ گیت

اور ڈوھڑے وغیرہ اپنی پسند کے مطابق گاتا تھا اور اپنی مرضی کی ترتیب اور انتخاب میں کسی دوست کو مخل نہیں ہونے دیتا تھا۔ پھر جس حسنِ ترتیب اور حسنِ ادا سے وہ گاتا تھا اس میں مخل ہونے کی گنجائش ہی کہاں ہوتی تھی۔۔۔۔ بارہا سنائے ہوئے گیت کو بھی وہ ہر بار کوئی نہ کوئی ایسا نیا پچ دے دیتا کہ سامعین اسی کی تحسین کا حق ادا نہ کر پاتے۔ بالخصوص ڈوھڑے اور ماہیے کا انداز تو ہر دوسرے تیسرے دن یکسر مختلف ہوتا۔ ان دو اصناف میں عطاء نے ایسے ایسے انوکھے انداز وضع کیے کہ اس کی صلاحیتِ اختراع کی داد الفاظ میں نہیں دی جا سکتی۔ اس سلسلے میں میرا یہ دعوی بے جا نہ ہوگا کہ ڈوھڑا اور ماھیا کے جتنے مختلف انداز عطاء نے ایجاد کئے ہیں تمام ہم عصر گلوکار مل کر بھی اتنا تنوع تخلیق نہیں کر سکتے۔

رُٹھی نہ منیساں۔۔۔۔

وہ رات جب عطاء ایک تازہ جذباتی سانحے سے دوچار ہوا تھا۔ اس رات کے سامعین۔ ماسٹر وزیر، لالا یوسف خان، ملازم حسین طبلہ نواز اور میں۔۔۔۔۔ لالا نے اس رات صرف ایک ہی گیت گایا۔۔۔۔ جی ہاں، مسلسل چار گھنٹے ایک ہی گیت۔۔۔ ایک قدیم لوک گیت پر میری تضمین۔۔۔۔ بول تھے "رُٹھی نہ منیساں بہوں ناراض آں ڈھولے تے"

آغاز گیت کا اس ڈوھڑے سے ہوا:

سجن میڈے کوں سمجھ نہ آئی، سمجھیند یاں عمراں ڈھل گئی
پچھے دلبر دے میں کملے دی سکھی جندڑی دکھاں وچہ گل گئی

اس ڈوھڑے کے بعد گیت کا پہلا بند اور پھر۔۔۔ اسی بند کے مفہوم پر فیض، فراز، شکیب، سیف اور ساحر کے اشعار، یونس خان مرحوم کے ڈوھڑے اور جگر گداز ماہیے۔ یہ سب کچھ اس حسنِ ترتیب سے کہ اول سے آخر تک ایک ہی شاعر کا کلام لگتا تھا۔ شکوہ و شکایت سے لبریز اس تمام تر شاعری کے پس منظر میں ایک تازہ بحث۔۔۔۔ محبوبِ زود رنج کی بے جا برہمی کا دکھ۔۔۔۔

ہوا یہ تھا کہ عطاء کے بعض بزرگوں کی فرمائش پر بس سٹینڈ کی جامع مسجد کے خطیب صاحب نے جمعہ کے خطبے میں پورا زورِ خطابت عطاء کے ایک تازہ معاشقے کی مذمت میں صرف کر دیا۔ ان کے محبوب دلنواز کے وہ وہ لچھن بیان فرمائے کہ سامعین کانوں کو ہاتھ لگاتے نہیں تھکتے تھے۔ ستم یہ کہ گھر اس بُتِ کافر کا عین مسجد کے زیرِ سایہ واقع تھا۔ لہٰذا لاؤڈ اسپیکر کی وساطت سے اس نے بھی یہ سب کچھ اپنے حسین و جمیل کانوں سے سنا۔

ادق عربی گالیاں تو اس کی سمجھ میں کیا آئی ہوں گی، البتہ حضرت واعظ کے لب و لہجے سے اتنا اندازہ ضرور لگا لیا کہ بات اس کے حسن و جمال کی نہیں، بلکہ کردار کی ہو رہی ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ شام کو وقتِ معین پر عطاء بن سنور کر کوئے دلدار سے گزرا تو اس گھر کی منڈیر سونی پڑی تھی۔۔۔۔صرف ایک نامراد کوا اپنی کرخت بولی میں اس ویرانی کے اسباب پر روشنی ڈالنے کی ناکام کوشش کرتا نظر آیا۔

گھر واپس آ کر قاصد کی خدمات حاصل کیں تو جواب یہ آیا کہ بس صاحب، بہت ہو چکی۔اب مرتے دم تک آپ سے نہ بات ہوگی نہ ملاقات۔۔۔۔نامہ و پیام سب موقوف۔

عطاء نے بڑے صبر و تحمل سے یہ جواب سنا۔ چند لمحے سر جھکائے کچھ سوچتا رہا۔۔۔۔

پھر چپ چاپ اُٹھا اور برابر والے کمرے سے ہارمونیم اٹھا لایا۔ چند منٹ اس کی خوبصورت انگلیاں ہارمونیم کے سروں سے کھیلتی رہیں اور پھر کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑاتا یہ مصرعہ اونچے سروں کی شاخوں سے ٹپک کر کائنات کی جھیل کی پرسکون سطح میں ارتعاش پیدا کر گیا۔

رُٹھی، نہ منیساں، بہوں ناراض آں ڈھولے تے

اس مصرعے کے ہمراہ عطاء کے دو آنسو بھی تھے جو ہارمونیم کے سروں میں گر کر پہلے تو نظروں سے اوجھل ہو گئے، مگر آواز کی شکل میں ہارمونیم سے نکلے تو در و دیوار پر بھی رقت طاری ہو گئی۔۔۔۔اس کے بعد ناطق کا ڈوھڑا۔۔۔۔پھر اس گیت کا مکھڑا۔اور پھر فیض، فراز اور شکیب وغیرہ کے اشعار، مزید ڈوھڑے سے اور ماہیے اور ہر شعر، ڈوھڑے اور ماہیے کے بعد

رُٹھی، نہ منیساں، بہوں ناراض آں ڈھولے تے

گلوکار کی آنکھوں میں آنسو، سامعین دنیا و مافیا سے بے خبر۔۔۔۔پوری کائنات ایک سوز، میں ڈوبی آواز بن کر بار بار یہی مصرعہ الاپ رہی تھی

رُٹھی، نہ منیساں، بہوں ناراض آں ڈھولے تے

اور پھر۔۔۔۔پتہ ہے کیا ہوا؟۔۔۔۔۔دروازے پر ایک ہلکی سی دستک سنائی دی۔۔۔۔۔۔

یاد میں تیری جاگ جاگ کے ہم۔۔۔۔۔

محمد رفیع مرحوم کا یہ مشہور و معروف گیت عطاء سے بارہا سنا۔۔۔مگر وہ رات۔۔۔۔عطا کے ایک دوست عاصم، عطا اور میں۔۔۔۔سردیوں کی تاریک رات مسلسل شدید بارش

کے باعث میکدے کے بقیہ ہم نشیں اپنے اپنے گھروں میں مقید رہے۔۔۔ہم نے شام کا کھانا میکدے ہی میں کھایا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے، اور پھر حسب معمول عطاء ہارمونیم اٹھا لایا۔ وہیں چارپائی پر ہارمونیم رکھ کر اس نے محمد رفیع مرحوم کا یہ گیت چھیڑا۔ گیت شروع ہوتے ہی عاصم کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ بس پھر کیا تھا، ذرا سی دیر میں ہم تینوں (خدا جانے کیوں) زار و قطار رو رہے تھے۔ صبح تک نہ بارش رکی، نہ ہمارے آنسوؤں کی جھڑی اور نہ گیت۔ ایک ایک مصرعہ بیسیوں بار دہرایا گیا۔ اور درمیان میں عطا نے حسب عادت برمحل ڈوھڑوں، ماہیوں اور اشعار سے وہ رنگ باندھا کہ پوری کائنات کے دکھ درد سمیٹ کر اس چھوٹے سے سادہ کمرے کے در و دیوار پر سجا دیئے۔ جدھر نگاہ اٹھتی آنسوؤں کا ایک سیل رواں آنکھوں میں اُمڈ آتا۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اگلی صبح ہم نے ایک دوسرے سے اس قدر زار و قطار رونے کا سبب پوچھا، تو ایک اداس تبسم کے ساتھ ہر ایک نے یہی جواب دیا۔۔۔

''بس یونہی''

تنگ دستی کے وہ دن۔۔۔۔۔

اس زمانے میں عیسیٰ خیل میں ٹیپ ریکارڈر اکا دکا خوش نصیبوں کے پاس ہوا کرتا تھا۔ اپنا ٹیپ ریکارڈر خریدنے کی توفیق ہم لوگوں میں سے کسی کو بھی نصیب نہ تھی۔ مگر ہر رات کی محفل کو ریکارڈ کرنے کا شوق دستِ سوال دراز کرنے پر مجبور کر دیتا تھا۔۔۔ دستِ سوال دراز کرنے میں کئی تلخ تجربے بھی ہوئے۔ ضمیر بھی برابر ملامت کرتا رہا۔ مگر مفلسی ضمیر کی آواز پر کان دھرنے لگے تو زندگی جہنم بن جائے؟

کبھی عطاء کہتا ''لالا منور آج فلاں صاحب سے ٹیپ ریکارڈر تمہیں منگوانا ہوگا۔ پچھلے ہفتے میں نے منگوایا تھا۔ اب دوسری بار مانگتے شرم آتی ہے۔ کبھی میں عطاء سے کہتا۔

''لالا میرے فلاں شاگرد نے نیا ٹیپ ریکارڈر خریدا ہے کہو تو آج وہی منگوالیں۔''

میرے دو شاگردوں (حفیظ خان اور مجیب اللہ ہاشمی) کے ٹیپ ریکارڈر ان دنوں زیادہ تر میری ہی تحویل میں رہے۔

تنگ دستی کے اس عالم میں جب ہمارے ایک ہم نشیں (ملک یار محمد پی ٹی آئی) کو اپنا ٹیپ ریکارڈر نصیب ہوا تو ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ جے وی سی (jvc) کا یہ ٹیپ ریکارڈر ان کے کسی عزیز نے سعودی عرب سے بھجوایا تھا۔ ایک عرصہ تک ہر رات کی محفل اسی

ٹیپ ریکاڈر سے ریکارڈ ہوتی رہی۔ اس زمانے میں سرائیکی اور پنجابی کے شعراء کی وہ بھرمار نہ تھی جو آج ہے۔ اس لئے عطاء زیادہ تر پرانے مقامی شعراء کا کلام گاتا تھا۔ پیر فرید فقیر کے علاوہ دو مرحوم مقامی شعراء، میانوالی کے ابراہیم غریب اور عیسیٰ خیل کے یونس خان کا کلام ایک مدت تک میکدے کی محفلوں میں خراجِ تحسین پاتا رہا۔ بالخصوص یونس خان کے یہ گیت تو ہر رات بلاناغہ گائے جاتے

کالاشاہ بدلا ناں وس توں ساڈے دیس
کیوں جے اجے تیئں ماہی راہندا اے پردیس
شالا رج رج ماڑیں سجن میڈا
ایہو جوبن اُٹھ دی جوانی

اور

کر کر منتاں یار دیاں
آخر آن جوانی ڈھلی

اور

جیڑے ڈیند دا توں پنتڑاں نکھڑ گیا ایں
غم ڈاہڈا ہاں کوں لائی پئی آں

مجبور عیسیٰ خیلوی کے یہ دو گیت بھی اکثر سنے جاتے

ڈے چالسی شالا جھگڑا وسی میڈی رانی

اور

بودی چھنگا ٹرنگ ٹرنگ

مؤخر الذکر گیت (بودی چھنگا ٹرنگ ٹرنگ) کی دھن بے حد مترنم اور وجد آور دھن ہے۔ اس لئے اس گیت کے ساتھ اجتماعی یا انفرادی رقص بھی ضرور ہوتا۔ شادی بیاہ کی تقریبات میں اس گیت پر اچھے خاصے سفید پوش بزرگوں کو ناچتے دیکھا ہے۔ والہانہ رقص کے ان بے ساختہ مظاہروں میں کئی چھپے رستم منظر عام پر آئے۔ خاص طور پر بعض عمر رسیدہ بزرگوں کی رقص کی مہارت دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ ماضی قریب تک لوگوں کا اپنے کلچر سے کتنا قریبی تعلق تھا۔ مگر آج ہم ترقی پسندی کے شوق میں اسے کتنا پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔

ذکر گیتوں کا ہو رہا تھا، بات رقص تک جا پہنچی۔ بہر حال اتنی دور نہیں گئی۔ گیت سے رقص تک ایک ہی قدم کا تو فاصلہ ہے۔

اسی زمانے میں ریڈیو پاکستان ملتان سے کوثر ملک کی آواز میں معروف لوک گیت ’’

ککڑا دھمی دیا سویرو ڈتی اپئی بانگ‘‘

نشر ہوا تو عطا کو پسند آ گیا اور اسی شام سے یہ گیت بھی میکدے کی محفلوں کا مستقل

آئیٹم بن گیا۔

ان گیتوں کے علاوہ عطاء بعض اوقات اپنی پسند کے مشہور فلمی گیت بھی گایا کرتا تھا۔

مثلاً محمد رفیع مرحوم کا یہ گیت

☆کوئی مجھ سے پوچھے کہ تم میرے کیا ہو

اور۔۔۔یاد میں تیری جاگ جاگ کے ہم

رات بھر کروٹیں بدلتے ہیں

لتا منگیشکر کا یہ مشہور زمانہ گیت

☆وہ دل کہاں سے لاؤں، تیری یاد جو بھلا دے

مجھے یاد آنے والے کوئی راستہ دکھا دے

پھر ملکۂ ترنم کا یہ پنجابی گیت

محبت تیری، زندگی میری

غزلوں میں عدمؔ مرحوم کی یہ غزل

جو بھی تیرے فقیر ہوتے ہیں

آدمی بے نظیر ہوتے ہیں

استاد قمرؔ جلالوی مرحوم کی بعض معروف غزلیں۔۔۔اور (کلام خدا جانے کس کا ہے)

یہ دو خوبصورت غزلیں

انہیں قصۂ غم جو لکھنے کو بیٹھے، تو دیکھے قلم کی روانی میں آنسو

یقیناً اثر ان کا ہوتا ہے دل پر نکلتے ہیں جو بے زبانی میں آنسو

اور

بے وفا تیرا یوں مسکرانا بھول جانے کے قابل نہیں ہے

ان تمام گیتوں اور غزلوں کے ہمراہ یونس خان، ابراہیم غریب اور ناطق نیازی کے ڈوھڑے اور درد بھرے ماہیے مل کر سروں کی ایک قوس قزح سی فضاء میں بکھیر دیتے۔

اردو کی غزلوں اور گیتوں میں پنجابی اور سرائیکی شاعری کی خوبصورت آمیزش عطاء کا وہ کمال ہے جس نے اسے معاشرے کے ہر طبقے کا محبوب گلوکار بنا دیا۔ اس کمال نے میکدے ہی میں جنم لیا اور وہیں جوان ہو کر کیسٹوں کی وساطت سے منظرِ عام پر آیا۔

ریاض کے اس دور میں بارہا ایسا بھی ہوا کہ ریڈیو یا ٹیلی وژن پر نشر ہونے والا کوئی گیت عطاء کو پسند آ گیا تو اس نے وہ گیت ریکارڈ کر لیا۔ اور تنہائی کے لمحات میں اس گیت کو بار بار سن کر اس کے الفاظ یاد کر لیے۔ پھر اس کی دھن کو اپنے مخصوص رنگ سے آراستہ کر کے محفلِ شب میں پیش کر دیا۔ مثلاً استاد امانت علی خان مرحوم کی آواز میں ابنِ انشاء کی شہرۂ آفاق غزل:

انشاء جی اٹھو اب کوچ کرو اس شہر میں جی کا لگانا کیا
وحشی کو سکوں سے کیا مطلب جوگی کا نگر میں ٹھکانہ کیا

پسند آ گئی تو کسی دوست کی معرفت استاد امانت علی خان کا وہ لانگ پلے ریکارڈ منگوا لیا جس میں یہ غزل پہلی بار ریکارڈ کی گئی تھی۔ اس غزل کی خاطر اپنا گراموفون بھی خریدا اور چند دن شب و روز یہ غزل سننے کے بعد اسے نہایت خوبصورت انداز میں گانے لگا۔

یادوں کا تحفظ

جیسا کہ پہلے کہیں عرض کر چکا ہوں عطا میکدے کی ہر شب کی محفل کی کارروائی (صرف موسیقی والا حصہ) ایک کیسٹ کی شکل میں محفوظ کر لیتا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ تمام کیسٹ اب بھی عطاء کے پاس محفوظ ہیں۔ ان کیسٹوں میں گیتوں کے علاوہ احباب کی داد بھی محفوظ ہے۔ ہر آدمی کا اپنا انداز تھا۔ بعض کیسٹوں کی نقل احباب کے ہاتھوں پھرتی پھراتی بعض مقامی میوزک سنٹروں کے ہاتھ لگ جاتی تو اس کی سینکڑوں کاپیاں دھڑا دھڑ بازار میں بکنے لگتیں۔ آج کل بھی ۷۷۔۱۹۷۶ میں ریکارڈ کیے ہوئے بعض کیسٹوں کی نقلیں بازار میں بک رہی ہیں۔ اور ہم اکثر شہر میں پھرتے پھراتے کسی ہوٹل کے سامنے سے گزرتے ہیں تو وہاں بآوازِ بلند بجتے ہوئے عطاء کے کیسٹ میں سے اپنی آواز میں جیو لالا کی صدا سن کر چونک اٹھتے ہیں، اور پھر زیرِ لب مسکرا کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ بعض اوقات نور محمد دیوانہ کی آواز میں ''جیویں'' سن کر آنکھوں میں آنسو اُمڈ آتے ہیں۔ یوں میکدے کی یادیں قدم قدم پر دامنِ دل تھام کر ہمیں ماضی سے بچھڑنے نہیں دیتیں۔

چاندنی راتیں۔۔۔۔۔

عیسیٰ خیل دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر دریا سے تقریباً ڈیڑھ میل کے

فاصلے پر واقع ہے، مگر دریا کی ایک شاخ جسے مقامی زبان میں واہی کہتے ہیں۔شہر کے جنوبی کنارے سے لگ کر گزرتی ہے۔واہی کی چوڑائی تقریباً سو میٹر اور گہرائی پانچ سات فٹ سے زیادہ نہیں ہوتی۔

موسم گرما کی چاندنی راتوں میں بعض اوقات موسیقی کی محفل واہی کی شفاف پر سکون سطح پر ایک کشتی میں برپا ہوتی عطا کی پرسوز آواز فضا میں بلند ہوتی تو سندھ کے پانی کی سطح پر چاند کا والہانہ رقص ایک عجیب سا سماں باندھ دیتا۔حیرت سے دم بخود ستارے آنکھیں جھپکنا بھول جاتے۔اور سطح آب سے چھو کر گزرتی ہوئی ہوا کے قدم بے اختیار رُک جاتے۔۔۔۔چاندنی راتوں کی ان روح پرور محفلوں کا سرور ان محفلوں کے حاضرین کو آج بھی رگ رگ میں محسوس ہوتا ہے۔

چاند کی پاکیزہ کرنوں،سندھ کے معطر پانی اور سطحِ آب پر تھرکتی ہوا سے براہ راست اکتسابِ فیض ہر فن کار کے نصیب میں کہاں؟ عطاء کو دوسرے فنکاروں سے ممتاز کرنے میں اور باتوں کے علاوہ،فطرت سے اس براہِ راست تعلق کا بھی بہت کچھ عمل دخل ہے۔

چاند کی کرنوں اور دریا کی روانی کی طرح عطاء کی آواز بھی دنیا کے کسی خطے کے لئے اجنبی نہیں۔ ورا پنے تعارف کے لئے یہ بھی کسی زبان کی محتاج نہیں۔یہ آواز وہ آواز ہے جس نے گلوکاری کا فن کسی معروف گھرانے سے نہیں بلکہ خود فطرت سے سیکھا ہے۔یوں لگتا ہے جیسے ورڈزورتھ نے یہ خوبصورت الفاظ عطاء ہی کے لئے تحریر کیے تھے کہ قدرت نے کہا:

My self shall to my darling be
Both law and impulse and with me
The child in rock and plain
In glad and bower in sun and shower
Shall feel an everseeing power
To kindle or restrain

جب ہم پہلی بار ملے تھے

عیسیٰ خیل سے ہمارا تعارف پہلے ہوا،عیسیٰ خیلوی سے بہت بعد میں۔۔۔ عیسیٰ خیل سے تعارف تو ۱۹۵۳ء میں ہوا جب ہم ساتویں جماعت کے طالبِ علم تھے اور ہمارے

والد محترم گورنمنٹ ہائی سکول عیسیٰ خیل میں ہیڈ ماسٹر تھے۔۔۔۔عیسیٰ خیلوی اس وقت بمشکل ڈیڑھ دو برس کا ہوگا لہٰذا اس کے فن اور شخصیت کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

کچھ معلوم نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانے میں ہماری اردو اتنی کمزور تھی کہ فن اور شخصیت کے معنی بھی معلوم نہ تھے۔

عیسیٰ خیلوی سے تعارف کا آغاز ۱۹۷۴ء میں ہوا۔ داؤدخیل میں ہمارے ایک دوست فضل دادخان ایک دن عطاء کا ایک پرانا گھسا پٹا کیسٹ کہیں سے لے آئے۔۔۔

کیسٹ گھسا پٹا تھا، مگر آواز ہمارے لئے بالکل نئی تھی۔ صرف نئی ہی نہیں بے حد مئوثر بھی۔۔۔پہلی نظر میں مبتلائے عشق ہونے سے تو ہم اللہ کے فضل سے آج تک محفوظ ہیں، مگر پہلی آواز پر مبتلائے عشق ہونے سے نہ بچ سکے، اس لئے کہ آواز عطاء کی تھی۔۔۔

اس آواز کو سن کر یوں لگا جیسے میرا ماضی مجھ سے بچھڑنے پر ماتم کناں ہو۔۔۔ یوں لگا جیسے بچپن میں جب کبھی میں بیمار ہوتا تو راتوں کے پچھلے پہر میری ماں میری تپتی ہوئی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر ایک دعائیہ لوری گنگنایا کرتی تھی۔۔۔عطاء جو گیت گا رہا تھا اس کی دھن اسی لوری سے ملتی جلتی تھی۔۔۔وہی محبت بھری آواز میرے لاشعور میں سے آتی ہوئی سنائی دی۔۔۔اور

دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں

ہر کہانی کا مرکزی خیال میری کوئی نہ کوئی محرومی تھی اور مرکزی کردار میں خود۔۔۔

احساس محرومی کا ایک اپنا سرور ہوتا ہے۔۔۔اس سرور کے عالم میں انسان خدا کو اپنی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب محسوس ہوتا ہے۔۔۔اسی سرور کے عالم میں جب مجبور اور بے بس انسان پکار اٹھتا ہے

خدائی رکھ کول آپنڑ یں

تو اسے نہ صرف یار داویڑا، بلکہ خدا خود بھی مل جاتا ہے۔۔۔یہ وہ مقام ہے جہاں شکوہ بھی شکر شمار ہوتا ہے۔

بات بہت دور نکل گئی۔ ذکر عطاء سے تعارف کا ہو رہا تھا۔۔۔عرض کیا نا کہ تعارف کا آغاز تو اس پہلے کیسٹ سے ہوا ہے۔ اس سے اگلا قدم ملاقات کا تھا۔

موسمِ گرما کی ایک غضب ناک دوپہر کو چار افراد کا قافلہ دو موٹر سائیکلوں پر داؤدخیل سے عیسیٰ خیل روانہ ہوا۔ فضل دادخان اور میں، ایک موٹر سائیکل پر، ضیاء اللہ خان (مرحوم) اور عبدالخالق دوسرے موٹر سائیکل پر۔ راستے میں عیسیٰ خیل سے پانچ میل ادھر کلور کے قریب ایک حادثہ بھی سرزد ہوا جس کے نتیجہ میں ضیاء اللہ خان اور عبدالخالق کے گھٹنے اور

کہنیاں بری طرح زخمی ہو گئیں مگر یہ اللہ کے بندے پھر بھی خوش تھے کہ جان تو بچ گئی۔
دو لہولہان ساتھیوں کے ہمراہ ہم عیسیٰ خیل شہر میں داخل ہوئے تو لوگ قدم قدم پر روک کر پوچھتے کہ خیریت تو ہے؟ کسی سے لڑائی جھگڑا تو نہیں ہوا۔۔۔؟ اور ہم الٹے سیدھے جواب دیتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔

عطاء کے گھر کا اتہ پتہ پوچھنے کے لئے، میرے ایک پرانے دوست احسن خان صاحب کے ہاں پہنچے۔ ان سے یہ سن کر بہت خوش ہوئے کہ عطاء ان کے قریبی عزیز ہیں، لہٰذا عطاء سے تعارف میں بھی دقت پیش نہیں آئے گی۔ چائے وغیرہ سے ہماری تواضع کرنے کے بعد احسن خان ہمیں ہمراہ لے کر عطاء کے ہاں پہنچے۔

خوش قسمتی سے ہم عین وقت پر پہنچے کیونکہ عطاء اس وقت کہیں جانے کے ارادے سے میکدے کو تالا لگا رہا تھا ہمیں دیکھ کر رک گیا۔ پہلی بار عطا کو دیکھ کر ہمیں کچھ حیرت سی ہوئی۔ کیسٹ میں نغمہ سرا آواز سے ہم نے اس کی عمر کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا، سراسر غط نکلا۔ ہمارا اندازہ تھا کہ اس کی عمر تیس پینتیس برس سے کم نہ ہوگی، مگر ہمارے سامنے بیس بائیس سال کا دبلا پتلا سانولے رنگ کا نوجوان گہرے زرد رنگ کی شلوار قمیض میں ملبوس، آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

میکدے کا دروازہ کھول کر عطاء نے ہمیں بٹھایا، اور ملازم حسین طبلہ نواز کی تلاش میں کسی کو بھیج کر خود چائے پانی کا بندوبست کرنے گھر چلا گیا۔ واپس آیا تو کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہی باتیں جو آغازِ تعارف میں عموماً ہوتی ہیں۔ موسم کا حال، سفر کی داستان، گھر بار کی خیریت، ہمارے دو ساتھیوں کے زخمی ہونے کا قصہ البتہ ایک نئی بات تھی۔ حادثے کی تفصیلات بتائی گئیں۔ متاثرین کے زخموں کی نمائش ہوئی۔۔۔۔ میں نے عطاء سے کہا کہ صاحب، دل کے زخموں کی مسیحائی تو آپ کی آواز بلاشبہ کر دیتی ہے، آج ذرا ہمارے ان دو ساتھیوں کے گوڈوں گٹوں کی چارہ گری بھی ہو جائے۔ اس بات پر زخمیوں سمیت سب نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔۔۔۔ اتنے میں ملازم حسین طبلوں کی جوڑی کندھے سے لٹکائے آ گیا، علیک سلیک ہوئی۔۔۔ عطاء ساتھ والے کمرے سے ہارمونیم اٹھا لایا ملازم حسین نے طبلے کے مزاج درست کیے اور محفلِ موسیقی کا آغاز ہوا۔۔۔ سب سے پہلے عطاء نے ایک غزل سنائی۔ مطلع تھا:

انہیں قصہ غم جو لکھنے بیٹھے تو دیکھے قلم کی روانی میں آنسو
یقیناً اثر ان کا ہوتا ہے دل پر نکلتے ہیں جو بے زبانی میں آنسو

اس کے بعد یونس خان کا مشہور گیت

شالا رج رج مانیں سجن میڈا اہو جوبن اُٹھدی جوانی دا

سدا قائم رہی رنگ مدھ بھریا تیڈی چن جئی شکل نورانی دا

محفل تقریباً دو گھنٹے جاری رہی۔ عطاء کو سن کر یہ محسوس ہوا کہ کیسٹ سننا تو خط کی طرح آدھی ملاقات ہے۔ اصل مزا تو سامنے بیٹھ کر سننے میں ہے کہ عطاء سامعین کے مزاج کے عین مطابق اور ان کی توقعات سے کہیں زیادہ خوبصورت انداز میں گاتا ہے۔۔۔ سامعین کے دل کی بات بن پوچھے سمجھ کر وہی بات اشعار اور ماہیوں کی صورت میں پیش کرنے کا کمال عطاء ہی کا حصہ ہے۔ محفل کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، عطاء پوری محفل کو ساتھ لے کر چلتا ہے اور کوئی بھی فرد خود کو تنہا محسوس نہیں کرتا۔

نمبر دار کے سر پر ہارمونیم

اگلے ہفتے فضل داد خان اور میں عطاء کو لینے کیلئے عیسیٰ خیل پہنچے، عطاء نے بتایا کہ وہ بعض گھریلو مصروفیات کے باعث شام کے بعد ہی داؤدخیل پہنچ سکے گا۔ شام کے وقت عیسیٰ خیل سے داؤدخیل کو چونکہ بس وغیرہ نہیں جاتی تھی اس لئے طے یہ ہوا کہ ہم موٹر سائیکل عطاء کے پاس چھوڑ جائیں اور خود ملازم حسین کو ہمراہ لے کر بس سے چلے جائیں۔ ملازم حسین کے ہمراہ ہارمونیم اور طبلوں کی جوڑی بھی تھی، جوڑی تو اس نے خود اٹھائی ہارمونیم فضل داد خان کے حصے میں آیا۔۔۔ (فضل داد خان چونکہ سکول کے زمانے میں ہمارے شاگرد رہ چکے تھے لہٰذا ہارمونیم اٹھانے کی سعادت طوعاً و کرہاً انہیں کو برداشت کرنا تھی)۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ فضل داد خان اس زمانے میں اپنے محلے کے نمبر دار بھی تھے۔۔۔ نمبر دار کے سر پر ہارمونیم۔۔۔ ہے نہ انوکھی بات؟

فضل داد خان کو یہ فکر لاحق تھی کہ اس حالت میں اگر کوئی واقف کار مل گیا تو کیا ہوگا؟ اس لئے ہم نے بس سٹاپ پر جانے کی بجائے عادل بخاری کے قبرستان میں سے ہو کر شہر سے باہر ریسٹ ہاؤس کے قریب بس روکنے کا فیصلہ کیا۔۔۔ بس تو جلد مل گئی مگر ایک لطیفہ وہاں بھی ہو گیا۔۔۔ بس رُکی تو کنڈیکٹر نے ہارمونیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فضل داد خان سے کہا "استاد یہ اندر رکھو گے یا بس کی چھت پر رکھ دوں؟ ہارمونیم کے حوالے سے اپنے لئے استاد کا لقب سن کر فضل داد خان جھنجھلاہٹ کے باوجود ہنسی ضبط نہ کر سکے۔ جب کبھی ان سے ملاقات ہوتی ہے کنڈیکٹر کا یہ فقرہ بار بار دہرا کر ہم دونوں بے تحاشہ ہنستے ہیں۔

داؤد خیل کے بس سٹینڈ پر بس رکی تو اتفاق سے فضل داد خان کے ماموں جان سامنے کھڑے تھے ان کے سامنے ہارمونیم کو ہاتھ لگانا فضل داد خان کے لئے خاصا نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ ہارمونیم اٹھا کر بس سے برآمد ہونا ہماری غیرت کو بھی گوارا نہ تھا۔ ادھر کنڈیکٹر شور مچا رہا تھا کہ ''استاد واب نیچے بھی اترو۔ بس کو آگے بھی جانا ہے''۔

سخت کشمکش کے اس عالم میں میری نظر اپنے سکول کے چپڑاسی خادم حسین پر پڑی۔ اطمینان کا ایک طویل سانس لے کر ہم نے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ ہارمونیم اس کے سر پہ رکھا اور بس سے اتر کر گھر کی راہ لی۔

شام کے بعد عطاء بھی حسب وعدہ پہنچ گیا۔ اعجاز خان اس کے ہمراہ تھے رات بھر موسیقی کی محفل برپا رہی۔ یہ محفل اس لحاظ سے ایک یادگار محفل تھی کہ اس سے داؤد خیل کے لوگوں پر ہماری اہمیت روز روشن کی طرح واضح ہو گئی۔ اور عطاء کا دوست سمجھ کر کچھ ایسے لوگ بھی ہمارے عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے جن سے ہم ذرا بچ کے گذرتے رہے۔

صبح چار بجے کے قریب محفل ختم ہوئی اور عطاء نے ہم سے اجازت چاہی بادل ناخواستہ ہمیں اجازت دینا پڑی۔ کیونکہ اعجاز خان نے علی الصبح پنڈی روانہ ہونا تھا۔

داؤد خیل میں

۱۹۷۴ء میں داؤد خیل کے بعض احباب کے پرزور اصرار پر ہم نے عطاء کو داؤد خیل میں ایک محفل نغمہ منعقد کرنے کی دعوت دی۔ یہ محفل فضل داد خان کے ایک عزیز کے گھر پر منعقد ہوئی۔ نہایت غریب و سادہ سی محفل تھی۔ نہ سٹیج کا اہتمام، نہ لاؤڈ اسپیکر کا انتظام، تمام تر رازداری کے باوجود اس تقریب کی خبر گلی محلے کی حد تک پھیل ہی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے۔ تین چار سو افراد کا مجمع اکٹھا ہو گیا۔

محفل تقریباً چار گھنٹے برپا رہی۔ عطاء نے بہت ٹوٹ کر گایا۔ اس محفل کے سامعین آج تک اس مترنم رات کے سحر سے آزاد نہیں ہو سکے۔ دیہات میں بجلی کی آنکھ مچولی تو روزمرہ کا معمول ہے۔

محفل عین شباب پر تھی کہ بجلی غائب ہو گئی گھپ اندھیرا چھا گیا مگر سامعین کی محویت کا یہ عالم تھا کہ بجلی کے غائب ہونے کا کسی کو احساس تک نہ ہوا۔ مگر اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ خود گلوکار بھی محویت کے اسی عالم میں گم تھا۔ یک لخت تاریکی

چھا جانے پر بھی نہ تو اس نے گانا بند کیا، نہ اس کی آواز پر اچانک اس تبدیلی کا کوئی اثر ہوا، اور نہ ہارمونیم کے سروں پر اس کی انگلیوں کے رقص میں لغزش آئی۔ اس قدر اعتماد سے نغمہ سرائی کرتا رہا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔۔۔

تقریباً بیس منٹ کی تاریکی کے اس وقفے کا علم سب لوگوں کو اس وقت ہوا، جب بجلی اچانک واپس آ گئی۔

میل مقدراں دے

یہ قصہ اس زمانے کا ہے جب ہم گورنمنٹ مڈل سکول ٹھٹھی (ضلع میانوالی) میں ہیڈ ماسٹر کے منصبِ جلیلہ پر فائز تھے۔ عطاء سے تعلق خاطر پیدا ہوا تو دل میں یہ خواہش انگڑائیاں لینے لگی کہ کسی بہانے ہم مستقل طور پر عیسیٰ خیل جا بسیں کاش ہماری ہر خواہش اس خواہش کی طرح بہت جلد پوری ہو جاتی۔

چند ماہ بعد پبلک سروس کمیشن کی مہربانی سے ہم انگریزی کے لیکچرار بن گئے تو ہماری خوش نصیبی دیکھئے کہ تقرر گورنمنٹ کالج عیسیٰ خیل میں ہوا۔ اس حسنِ اتفاق پر عطاء بھی خوش ہوا، اور یوں ہم دونوں ایک عرصہ تک ہم نوالہ دوست بن گئے (ہم پیالہ ہونے کا اعزاز آج تک نصیب نہیں۔ اور ہم اپنی اس محرومی پر خوش ہیں)۔

یہ وہ زمانہ تھا جب میکدہ پوری طرح آباد تھا۔ ہر رات آٹھ بجے سے دو بجے تک عطاء اپنی آواز کا جادو جگاتا۔ اپنی حیرت انگیز تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر نت نئی دھنیں ایجاد کرتا۔ پرانی دھنوں میں نت نئی تبدیلیاں کر کے ان کو نیا رنگ دیتا۔ آواز کی فضا میں بلند پروازی کے نت نئے ریکارڈ قائم کرتا۔ ہارمونیم کی زبان سمجھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ ہارمونیم کے چوتھے اور پانچویں کالے سر سے کسی گیت کا آغاز کر کے گانا کتنا مشکل ہے۔ اتنی بلند آواز میں گیت شروع کیا جائے تو دو تین سر آگے جا کر آواز اور سروں کی رفاقت زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہ سکتی۔ مگر یہ عطا ہی کا کمال تھا کہ سات کی بجائے نو اور دس سروں تک طویل سفر بھی اس کی آواز کے ترنم میں سرِ مو فرق نہ آتا۔

اس زمانے میں عطاء کا تعارف اکا دکا کیسٹوں کی وساطت سے اپنے ہی ضلع تک محدود تھا۔ یہ تعارف بھی صرف آواز کی حد تک تھا۔ صورت آشنا لوگ بہت کم تھے۔ اس ضمن میں ایک دو واقعات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

کوئی آشنا نہ تھا۔

ایک مرتبہ عطاء اور میں بس کے ذریعے عیسیٰ خیل سے داؤدخیل آئے۔ داؤدخیل کے بس سٹینڈ پر دو نوجوان نہر کے کنارے بیٹھے عطاء کا کیسٹ سن رہے تھے تجاہل ِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے میں نے ان سے پوچھا یہ کیسٹ کس کا ہے؟

''عیسی خیل کا ایک خان ہے عطاء اللہ''، اس کا ہے ایک نوجوان نے کہا

''عطاء اللہ کو کبھی دیکھا بھی ہے''۔ میں نے پوچھا

''ایک مرتبہ ایک شادی میں دیکھا تھا'' اس نے جواب دیا

''شکل وصورت کیسی ہے؟''

''کچھ کچھ ان بھائی صاحب سے ملتی جلتی ہے'' اس نے عطاء کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

ایک دن عطاء اور ہم پپلاں کے ریلوے سٹیشن سے گاڑی میں سوار ہوئے۔ گاڑی میں اتنا ہجوم تھا کہ بصد مشکل سے کھڑے ہونے کی جگہ مل سکی۔ گاڑی روانہ ہو رہی تھی کہ دو حضرات ہارمونیم اور طبلہ اٹھائے ہمارے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔ ہارمونیم اور طبلہ دیکھ کر لوگ ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ تو ہارمونیم والے صاحب نے تقریر شروع کی۔

''صاحبان، مہربان، قدردان۔ موسیقی کے فن مین مہارت کے دعوے دار تو ہر جگہ موجود ہیں۔ مگر دعویٰ وہ سچا جو میدان میں ثابت کر کے دکھایا جائے۔ تو صاحبان، مہربان، قدردان ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ آپ کوئی بھی فرمائش کریں گیت، غزل، ٹھمری، کچا راگ، پکا راگ، قوالی، ڈوھڑہ، ماہیا ہم آپ کی فرمائش اس طرح پوری کر کے دکھادیں گے کہ ہماری مہارت پر آپ عش عش کر اٹھیں گے۔''

اس تقریر کے بعد ان فن کاروں نے فن کا مظاہرہ شروع کیا، کچھ فرمائشی کچھ اپنی پسند کی چیزیں سنائیں سامعین نے ایک ایک دو دو روپے کے نوٹوں سے ان کے فن کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ حسبِ توفیق دو چار روپے ہم نے بھی نذر کیے۔

گاڑی اگلے سٹیشن پر رکی تو یہ محفل ختم ہوئی اور فن کار اپنا کام ختم کر کے رخصت ہونے لگے۔ ہم دروازے کے قریب کھڑے تھے۔ میں نے انہیں روک کر پہلے تو ان کے فن کی تعریف میں چند الفاظ کہے اور پھر بات کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا:

''استاد جی یہ بتایئے کہ آج کل جو لوگ شوقیہ گلوکار کر رہے ہیں، آپ کی رائے میں ان میں سے سب سے بہتر کون گا رہا ہے؟''

''اللہ آپ کو سلامت رکھے سرکار، ہماری رائے میں تو وہ لڑکا ہے نا عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی، اس سے بہتر کوئی نہیں گا سکتا۔ بے پناہ درد بھرا ہے قدرت نے اس کی آواز

میں''۔

''عطاءاللہ خان کو دیکھا بھی ہے؟''میں نے پوچھا

''جی سرکار، کندیاں میں ایک شادی کے موقع پر دور سے ایک نظر دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔

اور جب میں نے انہیں بتایا کہ میرے ساتھ کھڑے ہوئے صاحب عطاءاللہ خان عیسیٰ خیلوی ہیں تو ہارمونیم اور طبلہ ایک طرف پھینک کر انہوں نے عطا کے پاؤں پکڑ لیے۔

''معاف کر دو سرکار۔ ہمیں علم نہ تھا کہ آپ یہاں موجود ہیں کہاں آپ اور کہاں ہم۔۔۔۔ ہم تو آپ کی خاک پا ہیں سرکار۔۔۔۔ ایک عرصے سے آپ کی زیارت کی خواہش دل میں لیے پھرتے ہیں۔ ایک حقیر سی التجا ہے سرکار۔ فقیروں کی التجا رد نہ کیجئے گا (ہارمونیم عطا کی طرف بڑھاتے ہوئے) صرف ایک ڈوھڑہ ہو جائے سرکار۔۔۔ خالی الاپ ہی سہی۔

عطاء نے بڑے پیار سے انہیں سمجھایا کہ فی الحال ان کی فرمائش کی تکمیل ناممکن ہے۔ البتہ جب وہ چاہیں عیسیٰ خیل تشریف لے آئیں اور ان کے معزز مہمان بن کر جتنا عرصہ جی چاہے اسے سنتے رہیں۔

ایک رات عطاء رات گئے کندیاں سے واپس آ رہا تھا کہ پائی خیل کے قریب موٹر سائیکل کا ٹائر پنکچر ہو گیا اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ موٹر سائیکل کو کسی ٹرک یا کسی ویگن پر لا د کر میانوالی لے جائے اور وہاں سے پنکچر کی مرمت کرا کے گھر کی راہ لے۔ چنانچہ وہ وہیں سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا اور ہر آتی جاتی گاڑی کو روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ یکے بعد دیگرے تین ٹرک میانوالی جاتے ہوئے وہاں سے گزرے تینوں میں عطاء کے کیسٹ بج رہے تھے مگر سڑک پر کھڑے ہاتھ ہلاتے ہوئے نوجوان کو لفٹ دینے کی زحمت کسی بھی ڈرائیور نے گوارا نہ کی۔ انہیں کیا معلوم کہ جس آواز پر وہ سر دھنتے جا رہے ہیں، وہ آواز اسی نوجوان کی ہے۔

ماسٹر وزیر کے تعاقب میں

ہم سے دوستی کا کوئی اور فائدہ ہو نا ہو، یہی کیا کم ہے کہ اس بہانے لوگ دنیا کا حسین ترین شہر (میرا شہر، داؤد خیل) دیکھ لیتے ہیں۔ عطاء بھی کئی مرتبہ داؤد خیل آیا اور جہاں اس کی دلنواز شخصیت نے لوگوں کے دلوں پر جاوداں نقش مرتب کئے، وہاں بعض لوگوں کی محبت نے عطاء کے دل میں بھی امر یادوں کے چراغ ضرور روشن کیے۔

داؤدخیل میں عطاء کی آمدورفت کی پوری تفصیل تو بہت طویل ہو جائے گی۔ البتہ ایک واقعے کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔

ہوا یہ کہ ایک دفعہ گرمیوں کی چھٹیوں میں ماسٹر وزیر ہم سے ملنے داؤدخیل آئے تو پھرتے پھراتے چند اور احباب سے بھی ان کا تعارف ہوگیا۔ میرے ایک دوست ندیم صاحب کی باغ و بہار شخصیت ماسٹر صاحب کو کچھ ایسی بھا گئی کہ ہر دوسرے تیسرے دن باقاعدگی سے داؤدخیل آنا جانا شروع کر دیا۔ ندیم صاحب کے ہاں ہر وقت، ہر عمر اور ہر قبیل کے احباب کا مجمع لگا رہتا ہے۔ اس لئے ہر آدمی کو اپنی پسند کا آدمی بآسانی مل جاتا ہے۔ ہوا ماسٹر صاحب کے ساتھ بھی یہی، مگر وہ ایک عرصہ تک ہم سے چھپاتے رہے۔ عیسیٰ خیل کے احباب پوچھتے تو ماسٹر صاحب کا جواب یہ ہوتا کہ ''یار'' لالا منور کی شخصیت دل و دماغ پر کچھ ایسی چھائی ہے کہ اسے دیکھے بغیر چین نہیں آتا۔ بس اسی لئے ہر دوسرے تیسرے دن داؤد خیل جانا پڑتا ہے۔ مجھ سے کہتے کہ ''لالا'' آپ کے دوست ندیم صاحب نے تو مجھ پر ایک جادو سا کر دیا ہے کہ دو دن بھی اس کے بغیر رہا نہیں جاتا۔ حقیقت حال یہ تھی کہ توجہ کا مرکز نہ یہ فقیر تھا، نہ ندیم، انکشاف اس حقیقت حال کا عطاء کے ہاتھوں ہوا اور وہ اس طرح۔

ماسٹر وزیر کی عیسیٰ خیل سے اکثر و بیشتر غیر حاضری عطاء جیسے مزاج شناس کے لئے خاصی معنی خیز ثابت ہوئی۔ اس غیر حاضری کی جو وجہ ماسٹر صاحب بتاتے ہیں وہ عطاء کی نظر میں عذرِ گناہ بدتر از گناہ سے کم نہ تھی۔ چنانچہ اس نے سراغ رسانی کا ایک جامع منصوبہ فی الفور مرتب کر لیا۔

اسی اثناء میں ایک دن مجھے عیسیٰ خیل جانے کا اتفاق ہوا تو عطاء نے ماسٹر صاحب کی مصروفیات کے بارے میں پوچھا۔ میں نے بتایا کہ میرے علم کے مطابق تو ان کا زیادہ تر وقت ندیم صاحب کے ہاں بسر ہوتا ہے۔

''کتنی عمر کے ہیں یہ ندیم صاحب؟'' عطاء نے مسکرا کر کہا۔

''تیس پینتیس برس سے کم تو نہیں ہوں گے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اچھا، تو پھر بات کوئی اور ہے'' عطا نے ایک گہرا سانس لے کر کہا

اگلے دن دوپہر کو ندیم صاحب کے ہاں ماسٹر وزیر، یہ فقیر اور چند دوسرے لوگ جمع تھے۔

ماسٹر صاحب حسبِ معمول اپنی دلچسپ باتوں کے سبب میر محفل بنے ہوئے تھے۔ باتوں باتوں میں کسی دوست نے کہا

''ماسٹر صاحب، عطاء اللہ خان کا آپ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لہٰذا موسیقی میں کچھ نہ

کچھ تو دسترس آپ کو بھی ضرور ہوگی ۔''

''کچھ زیادہ نہیں'' ماسٹر صاحب نے کسرِ نفسی کے انداز میں کہا ''بس کبھی کبھی عطا کی مشکل دھن پر گرفت حاصل نہ کر سکے تو اس کی تھوڑی بہت رہنمائی کر دیتا ہوں'' ۔

''واہ صاحب! ندیم صاحب نے کہا، پھر تو آپ کا شمار موسیقی کے ماہرین میں ہونا چاہئے اور آج یہ بات منظرِ عام پر آ ہی گئی ہے تو ہو جائے کچھ نہ کچھ ۔ بس ایک آدھ گیت ہی سہی ۔''

''وہ تو ٹھیک ہے'' ماسٹر صاحب نے بڑے رعب سے کہا ''مگر ہارمونیم کے بغیر کبھی گاتا نہیں اب اول تو داؤدخیل میں ہارمونیم کہاں سے آئے گا ۔ اور آ بھی جائے، تو اسے بجائے گا کون، کہ ہم بڑے فنکار خود تو ہارمونیم کو ہاتھ تک نہیں لگاتے ۔''

''ہارمونیم بجانا ہمارے ذمہ'' ہم نے لوگوں کو مرعوب کرنے کا یہ موقع مفت میں ہاتھ آتا دیکھ کر کہا ۔ ہمیں یقین تھا کہ نہ تو من تیل ہوگا، نہ رادھا ناچے گی ۔

براہوذکی صاحب کا کہ وہ چند ہی منٹ میں کہیں سے ہارمونیم اٹھا لائے ۔ اب فرار کی کوئی راہ نہ ہمارے لیے تھی، نہ ماسٹر صاحب کے لئے ۔ ماسٹر صاحب نے کان پر ہاتھ رکھ کر اپنی ست رنگی آواز میں بھیرویں کا ڈوھڑہ شروع کیا اور ہم ہارمونیم پر ان کا تعاقب میں رواں ہوئے، ککڑا دھمی دیا والی دھن کے سوا کچھ بجانا آتا نہیں تھا لہٰذا اسی کو غنیمت سمجھا ۔

ڈوھڑا ختم کر کے ماسٹر صاحب نے گیت کا عنوان سے یہ غزل چھیڑی ۔

بے وفایوں تیرا مسکرانا، بھول جانے کے قابل نہیں ہے
میں نے وہ زخم کھایا ہے دل پر، جو دکھانے کے قابل نہیں ہے

پھانسی کے مستحق ہیں وہ سب سامعین جنھوں نے نہ صرف یہ سب کچھ گوارہ کر لیا، بلکہ بے تحاشہ داد بھی دیتے رہے ۔ ہوتے ہوتے بات اس مصرعے تک آ پہنچی ۔

ایسے عاشق کو سولی چڑھا دو، رحم کھانے کے قابل نہیں ہے

جونہی ماسٹر صاحب نے یہ مصرعہ شروع کیا دروازہ کھلا اور عطاء بڑے احترام سے اندر داخل ہوا فن کاروں کے ایک فرشی سلام کر کے مؤدب ایک طرف بیٹھ گیا ۔ فن کاروں کی حالت دیکھنے کے قابل تھی ۔ ہمارے ہاتھ سے ہارمونیم کا پنکھا چھوٹا، ماسٹر صاحب کا الاپ ٹوٹا، اوپر کا سانس اوپر، نیچے کا نیچے، ہم قہر باز نگاہوں سے ماسٹر وزیر کو اور وہ عطاء کو گھور رہے تھے ۔

عطاء نے ایک نظر سامعین پر ڈالی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ماسٹر صاحب کو مطلع کر دیا کہ داؤدخیل سے ان کی والہانہ وابستگی کا سبب اب مخفی نہیں رہا اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ بقیہ باتیں عیسیٰ خیل جا کر ہوں گی جن کے نتیجے میں یہ وابستگی اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکے

گی۔

پھر مجھ سے مخاطب ہو کر عطاء نے بتایا کہ حال ہی میں گجرات کے ایک پنجابی شاعر مظہر صاحب کی ایک خوبصورت غزل منتخب کی ہے مجھ سے ہارمونیم لے کر اپنی گود میں رکھا اور دھیمی آواز میں یہ غزل اپنی بنائی ہوئی خوبصورت دھن میں سنائی، طلع یہ تھا:۔

آس دا کاسہ ہو گیا خالی صدقہ پیار کسے دا

یہ غزل بعد میں عطاء کے کیسٹ والیوم نمبر میں ریکارڈ ہوئی۔

بے قدراں دی یاری

میانوالی کی ادبی تاریخ میں سید انجم جعفری اپنی حب وطن سے لبریز شاعری کے علاوہ انجمن آرائی کے حوالے سے بھی ایک اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ جس زمانے میں آپ مڈل سکول ماڑی انڈس میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہاں بڑے بڑے عظیم الشان مشاعرے منعقد ہوئے۔ اسی سلسلے کا ایک مشاعرہ غالباً اکتوبر ۱۹۷۷ء میں ضلع کے ایک اعلیٰ افسر کی صدارت میں ہوا۔ اس مشاعرے میں ضلع بھر کے معروف اہلِ قلم شریک ہوئے۔

مشاعرے کے انتظامات طے کرتے ہوئے جعفری بھائی کو بتایا کہ میرے ایک دوست عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی بہت اچھا گاتے ہیں۔ کیوں نہ مشاعرے کے بعد ایک مختصر سی محفل موسیقی بھی منعقد کر لی جائے۔

جعفری بھائی فوراً رضامند ہو گئے اور ہم نے عطاء کو بھی اس تقریب میں شمولیت کی دعوت دے دی۔ محدود وسائل کے باعث چائے پانی کا بندوبست چونکہ صرف شعراء کے لئے مخصوص تھا اس لئے سامعین سے محفل موسیقی کی خبر مخفی رکھی گئی۔ طے یہ ہوا کہ مشاعرے کے بعد چائے پی جائے گی اور پھر بزم نغمہ برپا ہو گی۔

تقریبات کی صدارت افسروں سے کرانے میں ایک قباحت یہ ہوتی ہے کہ ہر کام ان کے بنے ہوئے شیڈول کے مطابق کرنا پڑتا ہے۔ مشاعروں جیسی تقریبات میں یہ لوگ ازراہِ کرم آ بھی جاتے ہیں تو تقریب سے زیادہ فکر انہیں اپنی واپسی کی ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم نے صدرِ محفل کو موسیقی کے پروگرام کے بارے میں بتایا تو کہنے لگے ”دیکھئے میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔ البتہ چائے پینے کے دوران آپ کے دوست سے ایک آدھ چیز سن لیں گے“۔

میرا مقصد چونکہ دانشور طبقہ میں عطاء کو متعارف کرانا تھا اس لئے یہ ذلت آمیز

شرط بھی گوارا کر لی۔ سکول کے ایک کمرے میں چائے کا بندوبست تھا۔ چائے نوشی شروع ہوئی تو میں نے اعلان کیا کہ حضرات اب ایک ابھرتے ہوئے نوجوان فن کار عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی آپ کو فیض صاحب کی ایک غزل سنائیں گے۔

حاضرین کی بے حسی پر آج بھی آٹھ آٹھ آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے۔ عطاء نے غزل چھیڑی مگر وہ حضرات بدستور اپنی ادھر ادھر کی فضول باتوں میں مشغول رہے۔ کچھ بزرگ تو جناب صدر کے گرد گھیرا ڈالے حق خوشامد ادا کرتے رہے۔

''واہ صاحب! کیا غزل تھی آپ کی!''

صاحب آپ جیسا ادب پرور افسر تو زندگی بھر نہیں دیکھا''

''خدا کرے آپ ہزاروں سال میانوالی میں رہیں''

''حضور آپ کا کلام سن کر تو اپنی تمام تر شاعری بالکل بکواس لگتی ہے۔''

کچھ حضرات اپنے مختلف کاموں کے بارے میں گزارشات اور درخواستیں پیش کرتے رہے۔

شاعر اور اہلِ علم و قلم کہلانے والے ان لوگوں کی فن سے یہ بے اعتنائی اور کلام فیض کی یہ بے حرمتی میرے لئے ایک نہایت تکلیف دہ تجربہ تھی۔ جی تو چاہا کہ منٹو مرحوم کا وہ فقرہ ان کے منہ پر دے ماروں جو منٹو نے ایک پبلشر سے کہا تھا۔

''سالے آج تم جن تحریروں کو بے کار کہہ کر ٹھکرا رہے ہو کل یہی دنیا کی عظیم ترین کہانیوں میں شمار ہوں گی۔''

اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ منٹو کا یہ دعویٰ سو فیصد درست ثابت ہوا۔ اس دن اگر میں ان اہل علم و دانش سے کہتا کہ ظالمو آج جس فنکار سے تم اس قدر بے اعتنائی برت رہے ہو، کل یہی فن کار اپنے وقت کا مقبول ترین گلوکار قرار پائے گا اور تم اس سے متعارف ہونے میں فخر محسوس کرو گے'' تو بات سو فیصد درست نہ ہوتی؟

کچھ ایسی ہی سرد مہری کا مظاہرہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے اربابِ اختیار نے بھی کیا۔ جب عطاء ایک دور افتادہ علاقے کا ایک گمنام فنکار تھا، تو ایک دو مرتبہ اس نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی معرفت متعارف ہونے کی کوشش کی، مگر کوئی مؤثر سفارش نہ ہونے کی وجہ سے اربابِ بست و کشاد نے یہ عذر کر کے ٹال دیا کہ ''صاحب، آپ کی آواز ہمارے حساس' مائیکروفون قبول نہیں کر سکتے، لہٰذا ہم آپ کے لئے کچھ کرنے سے معذور ہیں''۔

اللہ کے فضل سے جب یہی عطاء کیسٹوں کی وساطت سے عوام کے دلوں کی دھڑکن بن گیا تو ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے حکام نے اسے گریڈ اے کا گلوکار قرار دے کر دھڑا

دھڑ پروگرام دینے شروع کر دیئے۔

گمنامی اور ناقدری دوراں کے تلخ دور سے ہر فنکار گزرتا ہے۔ منٹو کی مثال پہلے عرض کر چکا ہوں۔ ایک منٹو ہی کیا ہر بڑے فن کار کے ساتھ ابتداء میں یہی کچھ ہوتا رہا۔

شیکسپیئر کو جاہل اور سرپھرا کہا گیا۔ سب سے دلچسپ مثال ڈاکٹر سیموئیل جانسن کی ہے۔ موصوف جب انگریزی زبان کی لغت مرتب کر رہے تھے تو ناداری اور بے بسی کے عالم میں انہوں نے لارڈ چسٹر فیلڈ سے تعاون کی درخواست کی تھی۔ اور بین السطور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ تعاون کے اعتراف میں لغت ان کے نام سے منسوب کی جائے گی۔ مگر ادھر سے ان گزارشات کا جواب تک نہ ملا۔

پھر جب ڈاکٹر سیموئیل جانسن کی ان تھک محنت سے یہ لغت مکمل ہو کر منظر عام پر آئی تو لارڈ چسٹر فیلڈ نے ڈاکٹر سیموئیل جانسن کے نام ایک خط میں اس لغت کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔

اس خط کے جواب میں ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ڈاکٹر جانسن نے لکھا کہ جنابِ عالی! آپ کی اس ذرہ نوازی کا بے حد ممنون ہوں، مگر یہ ذرہ نوازی اس وقت کچھ عجیب ہی لگ رہی ہے، جیسے، ایک آدمی دریا میں ڈوب رہا ہو اور خود کو موت کے منہ سے بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو اور آپ کنارے پر کھڑے تماشہ دیکھتے رہیں، مگر جب وہ شخص اللہ کے کرم اور اپنی ہمت سے اپنی جان بچا کر دریا سے باہر نکل آئے تو آپ اس پر داد و تحسین کی بارش کر دیں۔۔۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ یہ کہاں کی غریب پروری ہے۔

لارڈ چسٹر فیلڈ جیسے کم خرچ بالا نشین مخیّر حضرات کے اسمائے گرامی عطاء کی داستان میں بھی آتے ہیں، مگر عطاء ہر حال میں ان کا بھرم رکھنے پر بضد ہے۔ لہٰذا وہ اسمائے گرامی لکھنے کی اجازت نہیں۔

محفل مہنگی پڑی

عیسیٰ خیل میں اپنے قیام کے ابتدائی دنوں میں میں چند پروفیسر ساتھیوں کے ساتھ عطاء کے محلے میں کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ ہمارے ایک مقامی دوست کو گلوکاری کا چسکا لگا تو پروفیسر صاحبان نے اس کے ساتھ ایک شام منانے کا پروگرام بنایا اس تقریب میں مہمانِ خصوصی کے علاوہ محلے کے بعض احباب بھی مدعو تھے۔ میں چونکہ ادھر میزبانی کے فرائض میں الجھا ہوا تھا اس لئے اس رات میکدے میں حاضری نہ دے سکا۔

میکدے میں دس بجے تک میرا انتظار کرنے کے بعد یار لوگ عطاء کی قیادت میں میری خیریت دریافت کرنے مکان پر پہنچے۔ تو دیکھا کہ یہاں ایک اور محفل موسیقی بپا ہے۔ یہ لوگ اندر آ کر سامعین کی صفوں میں چپ چاپ بیٹھ گئے۔

عطاء کو دیکھتے ہی طوطا چشم سامعین نے صاحبِ شام گلوکار سے آنکھیں پھیر لیں اور متفقہ طور پر یہ مطالبہ کرنے لگے کہ سنیں گے تو صرف عطاء کو، ورنہ کسی اور کو نہ سنیں گے نہ سننے کی اجازت دیں گے۔ ادھر عطاء نے کچھ سنانے سے صاف انکار کر دیا، ہمیں جلانے کے لئے یہ کہہ کر کہ جس گلوکار کی خاطر پروفیسر منور جیسے اہلِ ذوق و نظر لوگ آج یہاں پابند بیٹھے ہیں، میری کیا مجال کہ اس گلوکار کے مقابلے میں میدان میں قدم دھر سکوں۔

احباب کا اصرار حد سے بڑھا تو ہم بھی لگے عطاء کی منت سماجت کرنے، کہ لالا، بس ایک گیت۔ آپ کو ہمارے سر کی قسم ۔۔۔۔ ہماری دوستی کا واسطہ، وغیرہ وغیرہ مگر عطاء نے ایک نہ سنی اور اتنے نرم و نازک دل توڑ تاڑ کر اپنے احباب کے ہمراہ میکدے کو لوٹ گیا۔

سامعین کی طوطا چشمی سے دل برداشتہ ہو کر صاحب شام فنکار پہلے ہی رخصت ہو چکے تھے لہٰذا یہ محفل ہمارے لئے دو طرفہ بدمزگی کا ذریعہ بن گئی۔ ادھر صاحب شام ناراض، ادھر عطاء سے رنجش۔

اگلی صبح عطاء سے شکوہ کیا تو کہنے لگا "منور بھائی زیادتی سراسر تمہاری ہے۔ میرے ہوتے ہوئے تم نے کسی اور گلوکار کو اپنے ہاں بلایا کیوں تھا؟ اگر مقصد احباب کو محظوظ ہی کرنا تھا تو مجھے بلا لیا ہوتا۔ میرے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت ہے کہ موسیقی کی محفل تمہارے گھر پر ہو اور مجھے مدعو ہی نہ کیا جائے۔۔۔ بات خاصی معقول تھی اس لئے ہم خاموش ہو گئے، ورنہ گھر سے تو کیا کیا کچھ سوچ کر آئے تھے۔

شاعر بنا گیا مجھ کو

ماسٹر وزیر کے ہاں دوپہر کے کھانے کی دعوت تھی۔ مہمان ہم، عطاء اور لالا شفا۔۔۔ باتوں کے دوران عطاء کہنے لگا "منور بھائی اردو شاعری تو تم بہت اچھی کر لیتے ہو۔ آج میری خاطر ایک گیت پنجابی میں ہو جائے۔۔۔۔۔ کسی بھارتی فلم کا وہ گیت ہے نا

پنجرے کے پنچھی رے تیرا درد نہ جانے کوئی

اسی دھن ایک گیت پنجابی میں لکھ دو،

عطا کی فرمائش کی تعمیل میں میں نے اسی شام گیت لکھ دیا۔ بول تھے:

کملی دا ماہی وے دس کیہڑے پاسے جاواں

عطاء نے بڑی محنت اور محبت سے یہ گیت اسی شام سے باقاعدہ گانا شروع کر دیا۔ اس گیت کے یہ دو بند عطاء نے خاص طور پر بہت پسند کیئے۔

مار مکایا ظالم لوکاں
میں کیندے کیندے ہتھ روکاں
دل کردا اے چھوڑ کے تیرا شہر کتھے نس جاواں
دس کیہڑے پاسے جاواں

توں آکھیں تے اجے وی جیواں
جے آکھے تے ہن مر جاواں
دس تاں سئی میں کتنے تائیں در در ٹھوکراں کھاواں
دس کیہڑے پاسے جاواں

جب کبھی سنو گے گیت میرے

عطاء کی آواز میں میرے جو گیت اب تک منظرِ عام پر آ چکے ہیں انہیں تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول تو وہ گیت تھے جو میں نے کسی معروف فلمی دھن پر لکھے مثلاً:

کملی دا ماہی وے دس کیہڑے پاسے جاواں

اللہ ناں بھلاوے اے تاں ماہی والی ٹورا ے

کچھ گیت بعض قدیم لوک گیتوں پر تضمین کی صورت میں ہیں، جیسے:

☆ ساوی مورا کین تے بوٹا کڈھ دے چولے تے

☆ چن کتھا گذاری ائی رات وے

☆ چھلا پھل کریں اے

☆ سن جانی کتھے ونج توں وسیا ایں

☆ پھراں ڈھونڈیندی جوبن کالے والاں دا

☆ بے درد ڈھولا ایوں نئیں کریندا

بعض گیت خالصتاً طبع زاد ہیں، مثلاً

☆ سچی دس وے ڈھولا کل کیوں نئیں آیا

☆ رت ولی پکھواں دے جوڑے آ گئے

☆ بیٹھی دیوانی قبراں دے اوہلے

☆ نت دل کوں آہداہاں کل ماہی آسی

☆ اک خوبرو جوان جو گاؤں کا مر گیا (اردو قطعات اور سرائیکی ماہیے)

انگلینڈ پروگرام نمبر۲ والے کیسٹ میں سچی کہانی کے عنوان سے چند ڈوھڑے اور ماہیے بھی ہیں۔ یہ منظوم داستان میں نے عطاء ہی کی زندگی کے ایک سچے واقعے کو ذہن میں رکھ کر لکھی تھی۔تفصیلات بتانا افشائے راز کے مترادف ہوگا۔اس لئے یہ کہانی پھر سہی۔

ویسے میرے ہر گیت کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی سچی یا طبع زاد کہانی ضرور موجود ہے، بعض گیتوں کا پس منظر واضح کرنے کے لئے ایک دفعہ میں نے ان گیتوں میں ایک المیہ کہانی مرتب کر کے ایک کیسٹ میں ریکارڈ بھی کی تھی۔کہانی میری آواز میں تھی، گیت عطاء کی آواز میں۔افسوس کہ عطاء کے ایک کرم فرما نے وہ کیسٹ ہی غائب کر دیا۔

یوں تو میرے سب گیت کم و بیش مقبول ہوئے مگر

سچی دس وے ڈھولا کل کیوں نئیں آیا

اور

چن کتھاں گذاری ائی رات وے

کی مقبولیت نے عطاء کو بھی حیران کر دیا۔

''سچی دس وے ڈھولا کل کیوں نئیں آیا'' میں نے ۱۹۷۹ء میں لکھا۔عطاء اس زمانے میں اسلام آباد میں مقیم تھا۔ایک دفعہ عیسیٰ خیل آیا تو مجھ سے شکوہ کیا کہ اتنے عرصہ سے تم نے کچھ لکھ کر نہیں دیا۔میں نے وعدہ کر لیا کہ شام تک کم از کم ایک گیت ضرور لکھ دوں گا۔

یہ وعدہ کر کے میں سیدھا حضرت عقیل عیسیٰ خیلوی کے ہاں آیا اور ان سے کہا کہ حضرت مجھے فی الفور ایک گیت لکھنے کا حکم ملا ہے۔اس لئے آپ سے گذارش یہ ہے کہ چائے کی ایک تھرماس میرے سپرد کر کے یہاں سے چلتے بنیں، بلکہ دروازے کو باہر سے تالا لگاتے جائیں کہ آپ نہیں تو کوئی اور صاحب دماغ چاٹنے کو نہ آ جائیں۔اور کم از کم ایک گھنٹہ سے

پہلے ہر گز ہر گز واپس آنے کی جسارت نہ کریں، ورنہ۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔

بھلا ہو عتیل صاحب کا، کمال سعادت مندی سے انہوں نے یہ سب کچھ کیا۔ گیت تو آدھ گھنٹے میں مکمل ہوگیا۔ اپنی رضا کارانہ قید تنہائی کا باقی عرصہ ہم نے چائے پی پی کر پورا کیا۔ عطاء نے گیت دیکھا۔ بہت خوش ہوا اور فی الفور ہارمونیم لے کر دھن بنانے بیٹھ گیا۔ اتفاق سے حضرت ناطق بھی آ گئے۔ انہوں نے بھی گیت اور دھن دونوں کو بے حد پسند کیا۔ میں نے عطاء سے کہا کہ لالا! اس گیت کے ساتھ کیسٹ پر میرا نام نہ لکھوانا، کہ کہانی تمہاری ہے، میری نہیں۔ کہتے ہیں لندن کی ایک محفل مشاعرہ میں فیض صاحب سے ان کی شہرہ آفاق نظم

مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ

سنانے کی فرمائش کی گئی تو فیض صاحب نے فرمایا ''کون کہتا ہے کہ وہ میری نظم ہے۔ بھائی وہ تو ملکہ ترنم نور جہاں کی ہے جنہوں نے اسے گا کر اس کی قیمت ادا کر دی یہی بات میں اپنے اس گیت کے بارے میں کہوں گا، کہ یہ گیت میرا نہیں، عطاء کا ہے۔ جس نے یہ گیت گا کر اس کی قیمت ادا کر دی ہے۔

یہ گیت رحمت گراموفون کمپنی نے عطاء کے کیسٹوں کے پہلے سلسلے کے والیم ۱۶ میں ریکارڈ کیا۔ خوش قسمتی سے اس گیت کو ساز کی آرائش بخشی وزیر جیسے بلند پایہ موسیقار کے ہاتھوں ملی یوں اک کی اہمیت کچھ اور بھی سوا ہوگئی۔ ریکارڈنگ کے فوراً بعد عطاء اس گیت کا ماسٹر کیسٹ لے کر میرے پاس داؤد خیل آیا۔ عیدالفطر کا دن تھا، شام کا وقت۔ لالا اپنا گیت سنو گے؟ عطاء نے مجھے گلے ملتے ہوئے کہا۔

اور پھر اس نے اپنی گاڑی میں نصب ریکارڈ پلیئر پر پہلی مرتبہ یہ گیت سنوایا۔ بخشی وزیر کی موسیقی نے گیت کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ تقریبات میں آج تک عطاء سے یہ گیت ضرور سنا جاتا ہے۔ ایک آدھ مرتبہ لاہور جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں کے احباب میں عطاء نے مجھے اسی گیت کو حوالے سے متعارف کرایا۔

اس گیت کا اثر دیکھنا ہو تو عطاء کا وہ ویڈیو کیسٹ ملاحظہ کیجئے جو لوک ورثہ میں حال ہی میں ریکارڈ کیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ عطاء کی اس محفل کے میزبان ہیں۔ اس محفل میں عطاء جب یہ گیت گا رہا ہوتا ہے تو اس مصرعے پر

بہوں ظلم کیتیء چاچے دا جایا

صاحب نظر کیمرہ مین ایک چہرہ سامنے لاتا ہے اس چہرے کی آنکھوں میں تیرتے آنسو کسی کی داستان حیات کا ایک دردناک باب کھول کر سامنے رکھ دیتے ہیں۔

بہت عرصہ ہوا میں نے عطاء کا منظوم تعارف بھی لکھا تھا۔ پوری نظم تو اب یاد نہیں چند شعر ملاحظہ کیجئے:

اک درد بھری چیخ ہوں ناکام دعا ہوں
اجڑے ہوئے ماضی کی پریشان صدا ہوں
نغموں میں سمویا ہے لہو اپنے جگر کا
گیتوں کے بہانے یہ لہو تھوک رہا ہوں
کچھ لوگ یہ کہتے ہیں عطاء خود کو سنبھالو
''وہ دشمن جاں ہے، تو بھلا کیوں نہیں دیتے؟''
جینے کی ہوس اتنی کہاں ہے، مرے دل میں
ظالم مجھے مرنے کی دعا کیوں نہیں دیتے

گلوکار کی حیثیت میں عطاء کی بے مثال مقبولیت کسی شاعر یا موسیقار کی مرہون منت نہیں۔ یہ اللہ کا احسان ہے اور اللہ کسی کو مقبولیت عطا کرنے کے لئے شاعروں اور موسیقاروں کا محتاج نہیں۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ خود مسبب الاسباب ہے اس لئے، اسے اسباب کا سہارا نہیں لینا پڑتا۔ وہ دینے پہ آتا ہے تو اتنا دیتا ہے اور اس طرح دیتا ہے کہ خود لینے والا حیران و ششدرہ جاتا ہے۔ اور کوئی اپنی خوش نصیبی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ بس اتنا کہہ سکتا ہے کہ

یہ تو کرم ہے ان کا وگرنہ
مجھ میں تو ایسی بات نہیں

عطاء کو اللہ نے جو کچھ دیا وہ سب کے سامنے ہے، اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ اس کی شہرت، مقبولیت (محبوبیت کہنا زیادہ مناسب ہوگا) اور عزت کسی انسان کی عطا نہیں۔ وہ کسی کے کندھوں پر نہیں، بلکہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہے۔

عطاء کے ذکر میں ان شعراء کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں جن کا کلام عطاء ایک عرصہ سے گا رہا ہے۔ کیوں کہ لوگ ان کے خوبصورت کلام سے متاثر ہو کر ان کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ جاننے کے مشتاق ہیں۔ پیر فرید فقیر جیسے امر شعراء کے بارے میں تو لوگ پہلے ہی بہت کچھ جانتے ہیں یہاں ذکر ان شعراء کا مقصود ہے، جن کا کلام تو عطاء کی معرفت عالمگیر شہرت پا چکا، مگر ان کی ذات تا حال محتاج تعارف ہے۔

یونس خان نیازی (مرحوم)

یونس خان مرحوم عیسیٰ خیل کے پٹھان قبیلہ خانی خیل کے چشم و چراغ تھے۔ آج سے ۲۵ سال قبل تقریباً ۹۰ برس کی عمر میں وفات پائی۔ کہتے ہیں کہ یونس خان کی شاعری کا محرک ایک المناک واقعہ ہے۔ وہ یوں کہ آغازِ شباب میں یونس خان کسی دام محبت میں گرفتار ہوئے۔ عاشق اور محبوب دونوں نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ ایک دوسرے کے سوا کسی سے شادی نہیں کریں گے۔ شومئی قسمت سے محبوب نے حالات سے ہار مان کر کسی اور سے شادی کر لی، مگر یونس خان زندگی بھر اپنے حلف پر قائم رہے، اور ۹۰ سال کی عمر تنہا ہی بسر کی دی۔

کیا درویش صفت انسان تھا۔ اتنی لمبی عمر اکیلے گذارنا گوارا کر لیا، مگر قسم توڑنے کا گناہ گوارا نہ کر سکا۔ ایک ہم ہیں کہ بیسیوں قسمیں توڑ کر شرمندہ تک نہیں ہوتے۔ اور پھر بھی خوددار، باضمیر اور کیا کیا کچھ کہتے نہیں تھکتے۔

عیسیٰ خیل کے عمر رسیدہ لوگ بتاتے ہیں کہ یونس خان صبح سویرے گھر سے نکلتے اور دن بھر دریا کے کنارے کھجوروں کے جھنڈ میں بیٹھے فکرِ سخن میں مستغرق رہتے۔ شعر کہنے کی صلاحیت خداداد تھی۔ پڑھنے لکھنے سے نابلد تھے۔ مگر اپنے کلام کی حد تک پڑھنا لکھنا سیکھ لیا اور دو غیر مطبوعہ دیوان اپنی یادوں کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لئے چھوڑ گئے۔ تمام تر شاعری اپنی مقامی زبان میں کی۔ ہجر اور شکوہ کے مضامین مقامی اصنافِ سخن (ڈوھڑا، ماہیا اور گیت) کی شکل میں نہایت موئثر طور پر نظم کئے۔ یونس خان کے سادہ لفظوں میں کس قدر بے پناہ درد ہے۔

کرسیں یاد کڈاہیں میکوں پیا مردا ہاں جان جلا کے
تڑف تڑف میڈی جند پئی نکلے ماہی نام تہڈا چاچا کے
رب دے واسطے دلبر سوھنڑاں سبھالیں لاش میڈی کوں آ کے
سوہنڑیں ہتھاں نال یونس کوں رکھیں قبر دے وچ توں لہا کے

مجبور عیسیٰ خیلوی

سانولی رنگت، متبسم چہرہ، آنکھوں میں ایک پراسرار سی چمک، ریلوے میں ٹکٹ چیکر تھے۔ ملازمت میں سبکدوش ہو کر گوشہ نشینی کے مزے لوٹ رہے ہیں غلام حسین مجبور عیسیٰ خیلوی کا تعلق عیسیٰ خیل کے نواحی گاؤں شیخ محمود والا سے ہے۔ آپ

ریلوے میں ملازم ہیں۔ لکھنے کی ابتدا اردو میں کی اور تیس پینتیس برس پہلے بعض معروف جرائد میں ان کی نظمیں شائع بھی ہوتی رہیں۔ طبعیت لوک رنگ کی طرف مائل ہوئی تو اردو میں لکھنا ترک کر کے مستقل طور پر مقامی زبان میں لکھنے لگے۔ مجبور کے گیتوں میں بے پناہ ترنم ہے۔ لوک دھنوں کا جو ذخیرہ مجبور کے پاس ہے کہیں اور دیکھنے سننے میں نہیں آیا۔ گیت کے علاوہ ٹپہ بھی بہت خوبصورت لکھتے ہیں۔ عطاء نے سب سے زیادہ انہی کا کلام گایا ہے۔ ان کے تمام گیت مشہور و مقبول ہوئے۔ بالخصوص یہ گیت تو ہمیشہ زبان زد عام رہیں گے۔

☆ آوسیاں ساونیاں

☆ تیڈی دید نوں ترس گئیاں۔ وے پھٹنی نوکریاں

☆ بودی چنگا ڑنگ ڑنگ

☆ ڈھولا ملے نہ ونج وے

☆ لائی تیئیں مندری میری چالاں دے نال وئی وئی

☆ پخیر راغلے

☆ کوئی ڈھولے کوں سمجھاوے

اظہر نیازی

وضع قطع صوفیانہ، صحت قابلِ رشک، موم جیسا نرم دل محبت اور نفرت دونوں کی حدت ایک پل میں پگھل جاتا ہے۔

اظہر نیازی قمر مشانی، تحصیل عیسیٰ خیل کے ایک معزز پٹھان گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ قمر مشانی کے لاری اڈہ پر داتا سٹور محض ان کا ذریعہ معاش ہی نہیں ان کے چاہنے والوں کے روزانہ سفر کی منزل بھی ہے۔

اظہر نیازی نہایت ہی خوبصورت گیت لکھتے ہیں۔ قمر مشانی کے ایک نہایت سریلے فنکار عطاء زرگر مرحوم کی آواز میں ان کا گیت

راہنداایں توں کیوں غیراں نال ماہی دے

ان کا تعارف بنا۔ عطاء عیسیٰ خیلوی نے ان کے بہت سے گیت میکدے کی

محفلوں میں ریکارڈ کیے۔ ٹیلی ویژن پر عطاء نے پہلی بار اظہر نیازی ہی کا گیت
بے پرواہ ڈھولا کیوں ڈتا ائیی ساکوں رول
پیش کیا۔

خورشید عباس شاہ

شکل وصورت اور عادت واطوار قلندرانہ، دراز قد، وجیہہ نوجوان، آنکھوں میں ایک مخمورسی اداسی۔ ڈھیرا امید علی شاہ کے خاندان سادات سے تعلق رکھتے ہیں۔ عطا کے استاد محترم ناصرالدین بخاری مرحوم کے قریبی عزیز ہیں۔

عطاء کے کیسٹ والیوم نمبر ۱۴ میں خورشید شاہ کے ڈوھڑے بے حد مقبول ہوئے
خورشید شاہ ہجر کے مضامین نہایت مؤثر انداز میں نظم کرتے ہیں۔ ایک ڈوھڑہ ملاحظہ کیجئے۔

تساں کنڈ کیتی میتھوں سنگتی پچھدن دس کتھ گیا تیڈا سائیں
کیہڑے منہ نال آکھاں رس گیا ایں، تنگ کردن شام صباحیں
کرسر نیواں ودا وقت نبھینداں، اوتاں نت آلیندن بھائیں
جتھے خوش وسدا ایں خورشید کوں چن ہن گھن ونج آپ اتھائیں

ناطق نیازی

صوفی منش، کم گو، مگر بات کریں تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ سراپا خلوص، طبیعت نہایت حساس، عیسیٰ خیل کے پٹھان قبیلہ سرورخیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ المیہ مضامین ڈوھڑے میں نہایت خوبصورتی سے نظم کرتے ہیں۔

دو دل ٹٹ گئے، لٹ چمن گیا، ھک کوک معشوق دی آئی
کتھے یار گئیوں میں کملی دا ہیں پھردی وانگ سودائی
ھک پل وی چین نہ آوے میکوں، وسے بند بند دے وچ ماہی
ناطق دنیا ظلم کیتا اے میڈا سجن تاں ایویں ناہی

فاروق روکھڑی

عمر ساٹھ کے لگ بھگ، قد و قامت متناسب، صحتمند تمتماتا چہرہ، لباس درویشانہ

سادگی کا نمونہ، انداز گفتگو نہایت بے تکلف، مترنم آواز، اور باغیانہ لہجہ کی وجہ سے مشاعروں میں کامیاب ترین شاعر۔

فاروق روکھڑی کی مشاعری کی اہمیت اپنی جگہ، میرے دل میں ان کے لئے بے پناہ احترام اور محبت کی ایک وجہ اور بھی ہے، وہ یہ کہ والد محترم نے اپنی وفات سے صرف دو دن پہلے مجھ سے پوچھا تھا کہ

''یہ فاروق روکھڑی کون ہے؟''

''شاعر ہیں''۔ میں نے جواب دیا ''میرے بہترین دوست بھی ہیں۔''

''بہت اچھا لکھتا ہے'' والد محترم نے فرمایا ''تمہارے دوست عطاء نے اس کا وہ گیت گایا ہے نا:

کنڈیاں تے ٹر کے آئے تیڈے کولوں پیروانے
اگے تیڈی مرضی ڈھولن توں جانے یا نہ جانے

یہ گیت مجھے بے حد پسند ہے۔''

میں یہ سن کر حیران رہ گیا۔ زندگی میں میں نے کبھی والد محترم کو ریڈیو یا ٹیلی ویژن یا ٹیپ ریکارڈر پر گانا سنتے نہیں دیکھا۔ تاہم گھر میں ہم لوگ عطاء کے کیسٹ اکثر سنتے رہتے تھے۔ یوں کئی گیت غیر ارادی طور پر انہوں نے بھی سنیں ہوں گے۔ مگر پسند آیا تو فاروق روکھڑی کا گیت۔ یہاں یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ والد محترم گورنمنٹ لاہور کالج کے تعلیم یافتہ تھے اور شعر کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔

مسعود ملک کی آواز میں ٹیلی ویژن پر فاروق روکھڑی کی غزل

ہم تم ہوں گے بادل ہو گا
رقص میں سارا جنگل ہو گا

تو آپ نے بارہا سنی ہوگی۔ عطاء کی آواز میں جناب فاروق روکھڑی کے بے شمار گیت اور غزلیں مختلف کیسٹوں میں منظر عام پر آچکی ہیں۔ خاص طور پر مندرجہ ذیل گیتوں کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی:

☆ کنڈیاں تے ٹر کے آئے تیڈے کولوں پیروانے
☆ سوہنیاں دی خیر منگدے
☆ تیڈے در تے آن کھلوتی
☆ سانول نئیں آیا
☆ پچھیا کیر ساڈا حال وے ڈھولا کدی کدی

☆کل اساں ٹرونجڑاں

☆ایہو جیا رنگ بھر بولے تصویر وے

☆جنوں کو ضبط سکھا لوں تو پھر چلے جانا

☆یہ بات الگ تم سے جدا ہو

ملک آڈھا خان

ملک آڈھا خان نطقال قائد آباد ضلع خوشاب کے ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں ڈوھڑہ لکھنے میں خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ توصیف جمال سے لے کر عالم نزع تک کے مضامین میں سینکڑوں ڈوھڑے لکھ چکے ہیں۔ لفظوں کی نشست و برخاست کا سلیقہ ان کے کلام کی امتیازی خصوصیت ہے۔

سونا خان بے وس

سونا خان بے وس کا تعلق دلیوالا، ضلع بھکر سے ہے۔ ڈوھڑہ اور گیت دونوں اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں عطاء کی آواز میں ان کے درج ذیل گیتوں نے بہت شہرت پائی ہے۔

☆بہوں تڑپایا ای ڈھول نادانا ں

☆اللہ دی امان ہووی

☆قسمت چنگی جونا ھی

☆ڈیکھو عروج والو میڈا زوال ڈیکھو

☆تیکوں اپنا عہد وفا یاد ھوسی

☆دلاں دے تاجرا و دنیا والو

بری نظامی

بری نظامی فیصل آباد میں رہتے ہیں۔ ان کا ہر گیت زباں زد خاص و عام ہوا۔ خصوصاً

درج ذیل گیت بہت معروف ہیں:

☆عیسیٰ خیل دور تے نئیں

☆نی سسیے جاگدی رہئیں

☆تساکوں مان وطناں دا

☆نال تیڈے میں لالئیاں

☆میرے ورگا دنیا دے وچ

☆کھیڑے ہیر نوں ویاہ کے جدوں لے گئے

ماہیا

جذبات کے مؤثر اظہار میں ماہیا۔۔اگر خالص ہو۔۔۔۔دنیا کی کسی بھی زبان کی شاعری سے کم تر نہیں۔ یہ بات ذہن میں رہے، کہ خالص ماہیا کسی پڑھے لکھے شاعر کی تخلیق نہیں ہوتا یہ سراسر خداداد صلاحیت کی تخلیق ہوتا ہے اور وہ صلاحیت اللہ نے صرف اور صرف پنجاب کی ناخواندہ، مظلوم اور بے بس عورت کو عطا کی ہے۔ سماجی پابندیوں کی وجہ سے مشرقی عورت چونکہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتی اس لئے ماہیا ہمیشہ (Anonymous) ہوتا ہے یعنی اس کی تخلیق کار کا نام کبھی منظر عام پر نہیں آتا۔ ہر نیا ماہیا پہلی بار شادی بیاہ کی تقریبات میں خواتین کی اجتماعی نغمہ سرائی کے دوران کسی بھولی بھالی شرمیلی سی دوشیزہ کی زبان سے دھیمے سرون میں منظر عام پر آتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے زبان زد عام ہو جاتا ہے۔

ماہیے کے دلگداز اثر کو دیکھ کر بعض مرد شاعروں نے بھی ماہیا لکھنا شروع کر دیا اور یوں سینکڑوں ماہیے دیکھنے سننے میں آنے لگے، مگر ماہیوں کے اس ہجوم میں بھی ان پڑھ پنجابی عورت کا تخلیق کیا ہوا خالص ماہیا کنکریوں کے ڈھیر میں پڑے ہیرے کی طرح چمکتا دمکتا صاف پہنچانا جا سکتا ہے۔ ندیم صاحب کا مشہور شعر ہے:۔

میں کھل کے رو نہ سکا جب تو یہ غزل کہہ لی
بچھڑ کے مجھ سے مگر تو نے کیا کیا ہوگا

گستاخی شمار نہ ہو تو ندیم صاحب کی خدمت میں دست بستہ عرض کروں گا کہ اگر ''تو'' سے مراد کوئی پنجابی دوشیزہ ہے، تو اس نے ہزار ہا غزلوں سے بہتر ایک ماہیا تخلیق کر کے

اپنے بے زبان جذبوں کو یقیناً جاوداں بنا دیا ہوگا۔اور اس کے جذبات کے یہ بے ساختہ اظہار۔

گل ساڈھے اجڑن ڈی کدی ماہی وی سن باہسی

یا اس سے ملتے جلتے الفاظ میں کسی گلوکار کی زبان سے آپ بار ہا سن بھی چکے بھی ہوں گے۔ یہ الگ بات کہ اس ماہیے پر رو دینے کے باوجود شاعرہ کا نام آپ کو آج تک معلوم نہ ہوسکا ہو۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ ڈیڑھ مصرعے کے ماہیے میں مفہوم سارے کا سارا ایک ہی مصرعے میں سما جاتا ہے۔اوپر کا آدھا مصرعہ تو صرف قافیہ بندی کے لیے ہوتا ہے اور ننانوے فی صد ماہیوں میں اس آدھے مصرعے کا مفہوم سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا۔اس کے باوجود ایک ہی مصرعے میں بعض اوقات ایک مکمل افسانہ اپنے تمام تر لوازمات کے ساتھ بیان ہوجاتا ہے

یہ ماہیا دیکھئے:

رل کے میں انج مرساں ودے منیاں توں ناں پڑھسو

(اے میرے محبوب میں تمہاری تلاش میں ماری ماری پھرتی ہوئی اس طرح گم ہوکر مروں گی کہ میری قبر کی تلاش میں تم قبروں کے سرہانے لگی تختیاں پڑھتے پھرو گے۔)

عطاء کو اس جستجو میں کسی قبر کی تختی پر اسکا نام تو نہ مل سکا البتہ خالص ماہیوں کا ایک نادر و نایاب ذخیرہ ضرور ہاتھ آ گیا۔اس کے چند پسندیدہ ماہیے ملاحظہ کیجئے:

باغاں وچ امب جھلدے
سجن دانا ہوندے اساں دردر کیوں رلدے

اُڈ دا کاں ویندا
سجن مریندے نے تھی موت داناں ویندا

کاں اُڈ گیا کاں کرکے
لوکاں ساکوں لٹ کھڑیا سجناں داناں کرکے

کوٹھے توں اُڈ کانواں
پچھیں میڈے ماہیے توں میں جیواں کہ مرجاواں

سڑکی چوں راہ نکلے
قبر اچ جاہ رکھساں متاں ماہی وی آ نکلے

وکن املوک آیا

انج برباد کیتی ساکوں ویکھن لوک آیا

باغے وچ چرھڑی

حق ناہی ڈھولے دا، ساڈی عزت تباہ کرنی

کنڈا اجریب ہوسی

پتلا ڈھولا اللہ جانے کیندے نصیب ہوسی

راہواں چہ پھل سکدے

سنبھل کے ٹرڈھولا تیڈے قدماں دے مل چکدے

خالی صفحہ

قطرے سے گہر ہونے تک

خالی صفحہ

صحرا میں اک پھول کھلا

عیسیٰ خیل کے قبیلہ رب نواز خیل کے احمد خان نیازی کو اللہ تعالیٰ نے پہلے بیٹے سے نوازا۔ یہ بچہ دو بہنوں کے بعد پیدا ہوا، اس لئے اس کی پیدائش اس کے والدین کے لئے بے پناہ مسرت کا سبب ہوئی۔ والد نے اس کا نام عطاء اللہ خان رکھ کر اپنے اظہارِ تشکر کو مجسم کر دیا۔ قدرت کو شائد یہی اندازِ شکر اس قدر پسند آ گیا کہ اس بچے کو غیر معمولی صلاحیتوں سے مالا مال کر دیا۔۔۔ جادو بھری پر سوز آواز، دلکش شخصیت، عمدہ اخلاق اور پھر ان اوصاف سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی اہلیت۔ یہ آخری صفت قدرت کی سب سے اہم عنایت ہے۔ با کمال لوگوں اور عوام الناس میں فرق یہی صفت قائم کرتی ہے۔ ورنہ کچھ نہ کچھ خوبیاں تو ہر انسان میں ہوتی ہیں۔ بنانے والے نے کسی کو بھی یکسر محروم نہیں رکھا۔ مگر جن لوگوں کو اپنی خوبیوں سے پورا پورا فائدہ حاصل کرنے کی اہلیت عطا ہوئی وہی درجۂ کمال کو پہنچے، اچھا لکھنے والے ہزاروں ہیں، مگر غالب، اقبال اور فیض کی سی آفاقی شہرت و مقبولیت کتنوں کے حصے میں آئی؟ اسی طرح گائیکی کے میدان میں سینکڑوں لوگوں نے نام پیدا کیا، مگر ملکۂ ترنم نور جہان، لتا منگیشکر، محمد رفیع، مہدی حسن، پٹھانے خان اور عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کتنے ہیں؟

سید ناصر الدین بخاری (مرحوم)

ترنم اور پرسوز آواز قدرت کی دین ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی عطاء کو اس دین کا علم ہوا تو گانے کا شوق دل میں سما گیا۔ ابتدا میں یہ شوق مدرسہ میں حمد و نعت اور کلامِ اقبال سنا کر پورا ہوتا رہا۔ اساتذہ کی حوصلہ افزائی اور ساتھیوں کی داد و تحسین اس شوق میں برابر اضافہ کرتی رہی۔

عطا ہائی سکول میں پہنچا تو خوش نصیبی سے اسے سید ناصر الدین مرحوم جیسا باکمال استاد نصیب ہوا۔ سید ناصر الدین مرحوم اس زمانے میں گورنمنٹ ہائی سکول عیسیٰ خیل میں انگریزی کے استاد تھے۔ قدرت نے انہیں بے شمار نادر و نایاب صفات سے نوازا تھا۔ حیرت انگیز علمی قابلیت اور پرکشش شخصیت کے علاوہ شستہ، ادبی ذوق اور بلند آہنگ سریلی آواز نے انہیں ایک عجیب شان محبوبیت عطا کی تھی۔ ان کی نگاہ جوہر شناس نے عطاء میں ایک بلند پایہ فنکار کی خوبیاں دیکھ کر اسے اپنی خصوصی توجہ کا مرکز بنالیا۔ شاہ صاحب نے عطاء کی حوصلہ افزائی، سرپرستی، اور تربیت کر کے اسے بہت جلد اس عظیم گلوکار سے متعارف کرا دیا جو عطاء کے اندر تہذیب و تربیت کے مراحل طے کر رہا تھا۔ اور یوں عطاء نے کم سنی ہی میں گلوکاری کو اپنا نصب العین بنالیا۔ استادِ محترم نے اس کے طویل سفر کی راہ ہموار کی، دور، افق کے قریب منزل پر جگمگاتی شہرت، عزت اور مقبولیت کی روشنیاں دکھائیں، انگلی پکڑ کر چند قدم ساتھ چلے اور پھر لوٹ کر اپنے خالق حقیقی کے پاس چلے گئے۔

شاہ صاحب کی وفات کا سانحہ بالکل اچانک رونما ہوا۔ ابھی ان کی عمر ہی کیا تھی۔۔ بمشکل پینتیس تیس سال جمعہ کی چھٹی اپنے بچوں کے ہمراہ گذارنے کے لئے جمعرات کی شام عیسیٰ خیل سے ڈھیر امید علی شاہ آئے۔ اپنے گھر کے صحن میں آرام سے سوئے ہوئے تھے کہ نامعلوم قاتل نے صحن کی دیوار پر سے بندوق کا فائر کر کے چراغِ زیست ایک ہی پھونک میں گل کر دیا۔

میں کس کے ہاتھ پہ اس کا لہو تلاش کروں؟

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ شاہ صاحب بچپن میں میرے ہم درس رہے، میٹرک کا امتحان ہم دونوں نے گورنمنٹ ہائی سکول داؤد خیل سے ایک ساتھ پاس کیا۔ شاہ صاحب جماعت میں اول رہے میں دوم۔ اول اور دوم کی یہ ترتیب پچھلی جماعتوں میں کئی دفعہ بدلی۔ کبھی وہ اول، کبھی میں، مگر میٹرک کے امتحان سے بہت پہلے شاہ صاحب نے اپنے اوّل آنے کا اعلان کر دیا تھا اور دن رات محنت کر کے اس اعلان کو سچا ثابت کر دیا۔ محنت میں نے بھی بہت کی، مگر شاہ صاحب کی سی غیر معمولی ذہانت کہاں سے لاتا؟

شاہ صاحب کی ناگہاں وفات نے صرف ان کے بچوں کو ہی یتیم نہیں کیا، بلکہ ان سینکڑوں بچوں کو بھی یتیم کر دیا جن کے لئے شاہ صاحب کی بے پناہ شفقت باپ کی محبت سے کسی طرح کم نہ تھی۔

عطاء ان کا محبوب ترین شاگرد تھا۔ اس لئے اس پر اس سانحے پر جو بیتی بیان سے باہر ہے۔ شفیق استاد کی ہدایت پر اس نے گلوکار بننے کا عزم تو پہلے ہی کر لیا تھا۔ اب اس عزم میں استادِ محترم کی یاد کو زندہ رکھنے کا عزم بھی شامل ہو گیا۔ عطاء آج بھی نہایت عقیدت، احترام، محبت اور فخر سے شاہ صاحب کا نام لیتا ہے اور ان کا محبوب گیت:

کوئی مجھ سے پوچھے کہ تم میرے کیا ہو

گاتے ہوئے آج بھی اس کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

شاہ صاحب کا اعجازِ تربیت دیکھئے کہ عطاء کی شخصیت میں شاہ صاحب کی شانِ دلربائی ہو بہو نظر آتی ہے میں نے دونوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور کبھی کبھی عطاء کے روپ میں سید ناصر الدین شاہ کو زندہ وسلامت اپنے سامنے پایا ہے۔ استادِ محترم کی شخصیت کا اتنا گہرا اور دیرپا اثر۔۔۔ سبحان اللہ،

سانول تیڈے رنگ وچ رنگی بیٹھی آں
ساری دنیا کولوں چنگی بیٹھی آں

عطاء کے معاشقوں کا شمار وحساب رکھنے والے احباب کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ استادِ محترم سے محبت بھی عطاء کا ایک عشق تھا۔۔۔ اور عشق بھی کامیاب۔

سحر ہونے تک

عطاء کے والد محترم کی قلندرانہ خودداری ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی خودداری کو سلامت رکھنے کے لئے انہوں نے خاندانی جاگیر سے دست بردار ہو کر گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس کے شعبہ مالیات میں ملازمت کو ذریعہ معاش بنایا۔

ملازمت کا زیادہ عرصہ گوجرانوالہ میں اور کچھ عرصہ فیصل آباد میں بسر ہوا، ملازمت کی مدت پوری ہوئی تو عیسیٰ خیل واپس آ گئے۔ پنشن وغیرہ کی صورت میں جو رقم ملی اس سے کپڑے کی تجارت شروع کی۔ دیہات میں کپڑے کا کاروبار زیادہ تر ادھار پر چلتا ہے۔ مفلس و نادار گاہک تن ڈھانپنے کو حسبِ ضرورت کپڑا ادھار تو لے جاتے ہیں مگر اس کی قیمت کی وصولی ایک ایسا طویل اور تکلیف دہ عمل بن جاتی ہے کہ باضمیر انسان اس کاروبار سے بہت

جلد بیزار ہو جاتا ہے۔عطا کے والد اس کاروبار سے عاجز آ گئے تو ایک ڈیزل انجن خرید کر لکڑی چیرنے کا آرا لگوا لیا۔ یہ کاروبار بھی راس نہ آیا تو آٹا پیسنے کی چکی لگوالی۔سرمایا اتنا کم تھا کہ ملازم رکھنے کی استطاعت نہ تھی۔اپنی صحت تو اتنی کمزور تھی کہ خود کام کرنے کی ہمت نہ تھی۔۔ اس بے بسی کے عالم میں باہمت جوان بیٹا باپ کا سہارا بن گیا۔اور عطاء کی خوبصورت انگلیاں آرے سے لکڑیاں چیرنے اور آٹے کی چکی چلانے کی مشقت میں ایک عرصہ تک مبتلا رہیں۔مگر عطاء اس مشقت کو اپنے لئے عین راحت ورحمت سمجھتا تھا کیونکہ اس مشقت کے صلے میں اسے دنیا کی سب سے بڑی نعمت۔۔باپ کی دعائیں۔۔۔ ملتی تھیں۔

تنگدستی کا یہ دور عطاء کے لئے ہمت شکن آزمائش کا دور تھا۔اللہ کی عنایت نے آزمائش کے اس دور میں بھی اس کے اندر کے فنکار کو زندہ اور اس کے عزم کو جواں رکھا۔

عیسیٰ خیل جیسے دورافتادہ قصبے میں کوئی بھی کاروبار دووقت کی روٹی سے زیادہ کچھ نہیں دے سکتا۔آرا مشین اور آٹے کی چکی سے بھی کی ضروریات پوری ہوتی نظر نہ آئیں تو عطا کے والد بچا کھچا سرمایہ لگا کر راشن ڈپو کا کاروبار شروع کیا،اور یوں ایک عرصہ تک یہی کاروبار ان کا واحد ذریعہ معاش رہا۔

تنگدستی اور افلاس کے اس تکلیف دہ دور میں عطاء کی امی نے لختِ جگر کو کسی قسم کی احساس محرومی سے دوچار نہ ہونے دیا۔گھر کے خرچ میں سے کچھ نہ کچھ رقم بچا کر عطاء کو بہترین لباس اور معقول جیب خرچ برابر مہیا کرتی رہیں۔اس طرح لباس اور دوسری آشائسوں کے لحاظ سے عطاء نے خود کو کبھی کسی سے کم تر نہ پایا۔بلکہ اس کے ہم عمر نوجوان اس کی خوشحالی پر رشک کرتے تھے۔

ماں کی شفقتیں ہر مشکل وقت میں عطاء کی مشکل کشائی کرتیں رہیں۔خاندانی روایات سے آنکھ بچا کر عطاء کے شوق گلوکاری کی حفاظت اور پرورش بھی ماں نے کی۔عطاء نے ہارمونیم خریدنے کی فرمائش کی تو اس کے والد اس پر برس پڑے۔

''گھر کا خرچ تو پورا ہوتا نہیں اور صاحبزادہ میراثیوں والے لوازمات خریدنا چاہتا ہے۔ میں ان عیاشیوں کے لئے ایک پیسہ بھی نہیں دے سکتا۔خبردار جو آئندہ ہارمونیم کا نام بھی لیا''

''معافی چاہتا ہوں ابو۔غلطی ہوگئی'' عطا نے سر جھکا کر کہا۔

ابو تو یہ سن کر مطمئن ہو گئے،مگر امی کی غمگسار آنکھوں نے عطاء کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو دیکھ لئے تھوڑی دیر بعد ابو باہر گئے تو امی نے عطاء کو سینے سے لگا کر گلوگیر آواز میں کہا۔

’’دل چھوٹا نہ کر میرے لال۔ تیری فرمائش میں پوری کروں گی۔ تجھے ہارمونیم ضرور ملے گا۔‘‘

مگر وہ کیسے امی؟‘‘ عطاء نے قمیض کے دامن سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔’’ہارمونیم کیلئے رقم کہاں سے آئے گی؟‘‘ ابو ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے۔ ان کے پاس اتنی رقم کہاں ہے؟‘‘

’’تم فکر نہ کرو میرے لال۔ میرا زیور کس لیے رکھا ہے۔‘‘

عطاء نے اس پیش کش کی سختی سے مخالفت کی۔ مگر اس کے باوجود امی نے اگلے دن رقم زبردستی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

الصدف

والد کے کاروبار کی حالت کچھ بہتر ہوئی، تو عطاء نے عیسیٰ خیل کے مین بازار میں الصدف نام کا ایک چھوٹا سا جنرل سٹور بنالیا۔ یہ چھوٹا سا جنرل سٹور عطاء کی سلیقہ شعاری ،نفاست اور شستہ ذوق کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ شوکیسوں اور شیلفوں کی آرائش، رنگ و روغن، روشنی اور خوشبوؤں کی حسین آمیزش، شوکیسوں کے اندرونی جانب فیض، ندیم، ساحر اور ساغر صدیقی کے خوبصورت اشعار کے سٹیکر، اشعار کا انتخاب ہر ماہ نیا ہوتا۔

رات بھر کی شب بیداریوں کے باوجود عطاء بلا ناغہ ہر صبح سات بجے الصدف میں موجود ہوتا۔ صفائی اور جھاڑ پونچھ کا کام اپنے ہاتھ سے کرتا۔ اور پھر شام سات بجے تک اس قدر انہماک سے کاروبار میں مشغول رہتا۔ جیسے کاروبار کے سوا دنیا کا کوئی اور کام جانتا ہی نہ ہو۔ تاہم دائیں جانب کے شوکیس کے نیچے ایک دراز میں پڑے ٹیپ ریکارڈ پلیئر سے آتی ہوئی مدہم نغمہ سرا آواز اس ہمہ تن دکاندار کی شخصیت کے لطیف پہلو کا تعارف بھی کراتی رہتی۔ ٹیپ ریکارڈر پر مسلسل بجتے ہوئے اس کیسٹ کے ذریعے عطاء اپنے رات بھر کے ریاض کا تنقیدی جائزہ لیتا رہتا۔ کیسٹ کو بار بار پلے (Play) کر کے وہ اپنی آواز ہارمونیم اور طبلے کی سنگت، اور گیت کا مجموعی تاثر میں اصلاح کے امکانات تلاش کرتا رہتا۔ اس سلسلے میں جو بھی نیا آئیڈیا ذہن میں آتا اگلی رات وہ ایک کیسٹ میں محفوظ کر لیتا۔ یوں ایک ایک گیت کو بیسیوں مرتبہ سن کر عطاء اس پر اتنی محنت کرتا کہ اگلی مرتبہ وہ گیت ایک بالکل نئی چیز لگتا۔

الصدف جنرل سٹور پر گاہکوں کے علاوہ محفلِ شب کے بعض ساتھی بھی حاضری دیتے۔ گفتگو کا موضوع نہ سیاست ہوتا نہ موسیقی، بلکہ شہر کی نئی تازی خبریں، لطیفے اور

لطیف تر چھیڑ چھاڑ۔ خاص طور پر ماسٹر وزیر، شفاء اللہ ملک اور عطاء کی نوک جھونک سننے کے قابل ہوتی۔ دوستوں میں سے کوئی صاحب شفاء اللہ سے پوچھتے:۔

''لالا شفاء سنا ہے تمہارے ہاں کل کوئی مہمان تھا''۔

''اپنی ایسی قسمت کہاں لالا'' شفاء آہ بھر کر کہتا۔ ''مہمان میرا تھا لے اڑے یہ دونوں بے غیرت۔''

''اپنی قسمت کو بدلنے کی کوشش کرو، یار'' وہ صاحب کہتے۔

''عیسیٰ خیل میں تو ناممکن ہے لالا۔ کم از کم جب تک یہ دونوں (گالی) زندہ ہیں۔''

''تو عیسیٰ خیل چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟''

''ان حرامیوں کے بغیر کہاں جی لگے گا لالا''۔

''ایک بات بتاؤ شفاء''۔ کوئی اور دوست چھیڑتا۔ ''تمہارے سب کے سب مہمان بے وفا کیوں ہوتے ہیں؟۔''

''قصور ان بیچاروں کا نہیں ہوتا لالا'' شفاء ایک اور آہ بھر کر کہتا، ''کمینوں کی صحبت انہیں بھی کمینہ بنا دیتی ہے''۔

''وفا تو اس دنیا سے بالکل اٹھ گئی ہے لالا'' ماسٹر وزیر اپنی دانشمندی کا سکہ بٹھانے کی کوشش کرتے۔ ''اسی لیے تو میں نے یہ پکا فیصلہ کر لیا ہے کہ مر جاؤں گا مگر کسی سے دل نہیں لگاؤں گا۔''

''تم اپنا چونچ بند رکھو افلاطون کی اولاد'' شفاء کہتا ''کون کھوتی کا پتر تم سے دل لگائے گا؟''

دیکھو شفاء برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔

''برا نہ مانو ماسٹر'' عطاء جلتی پر تیل ڈالتا ''شفاء ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔''

''اچھا۔ تو پھر میں جا رہا ہوں۔ غیرت نام کی کوئی چیز اگر مجھ میں ہے تو آئندہ تم لوگوں سے بات تک نہیں کروں گا''۔۔۔۔ اور ماسٹر وزیر یہ اعلان کر کے دروازے کی طرف لپکتے۔

عطاء دوڑ کر انہیں پکڑ لیتا اور منت سماجت شروع کر دیتا۔

''دفع کرو لالا۔۔'' شفاء کہتا۔۔۔ اور ماسٹر وزیر عطاء سے ہاتھ چھڑا کر بھاگنے کی کوشش پھر سے شروع کر دیتے۔ عطاء ان کے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کر کے شفاء کو پانچ سات کراری گالیاں دیتا اور چند منٹ کے لئے دونوں محاذوں پر خاموشی چھا جاتی۔ اس قسم کے جذباتی منظر دن میں کئی بار دہرائے جاتے۔

کیسے کیسے لوگ۔۔۔۔

الصدف جنرل سٹور پر عطا کے نت نئے شیدائی بھی نازل ہوتے رہتے۔اس طرح عجیب وغریب شخصیات سے تعارف مفت میں ہو جاتا۔''لالا عطاء'' بھکر سے آئے ہوئے ایک صاحب نے علیک سلیک کے بعد کہا''میں بہت دور سے آیا ہوں۔میرا مسئلہ تم ہی حل کر سکتے ہو۔بات یہ ہے کہ میرا محبوب آج کل سخت بے وفائی کر رہا ہے۔اس لئے ایک ریل (کیسٹ) بھروانی ہے۔سڑے بھنے ہوئے گانوں کی۔'''' وہ کر کر منتاں یار دیاں، والا گیت ہونا چاہئے'' اور'' بے درداں دا کپتان ماہی والا'' ڈوہڑہ بھی، اور وہ غزل ہے نہ'' دل لگایا تھا دل لگی کے لئے'' وہ بھی۔۔۔۔بس ایسی ریل ہو کہ اس یزید کی اولاد کا دماغ درست کر دے۔''

''دماغ درست کرنے کے لئے تو آپ کا جوتا زیادہ مناسب رہے گا لالا۔'' شفاء ہنس کر بولا۔''اور ہاں یاد آیا'' وہ صاحب شفاء کی چوٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے بولے'' آخری بس چار بجے یہاں سے جاتی ہے۔اور مجھے آج ہی واپس بھی ضرور جانا ہے۔اس وقت۔۔۔دو بج رہے ہیں۔۔۔۔مہربانی کرو لالا۔۔وقت بہت کم ہے''۔

ہم حیران کہ عطاء ان صاحب سے کیونکر نمٹے گا۔مگر عطاء نے نہایت سکون سے ان صاحب کی یہ تقریر سنی اور پھر نہایت مغموم صورت بنا کر کہنے لگا۔

''مجھے تم سے بہت ہمدردی ہے لالا تم واقعی بہت دکھی معلوم ہوتے ہو۔کاش میں تمہاری فرمائش پوری کر سکتا۔دراصل بات یہ ہے کہ جس کی خاطر گانا شروع کیا تھا اُسی نے منع کر دیا ہے۔کہ خبردار جو آئندہ گانے کا نام بھی لیا۔اب تم ہی بتاؤ میرے دوست''۔

معافی چاہتا ہوں لالا۔وہ سب ہاتھ جوڑ کر بولے'' تم تو مجھ سے بھی زیادہ مظلوم ہو۔گولی مارو میرے محبوب کو۔۔۔۔وہ تو ہے ہی بے غیرت۔۔۔اس کی خاطر تمہاری وسدی جھوک کیوں اجھاڑ دوں؟ سچ پوچھو تو اس کی قیمت ایک کیسٹ کے برابر بھی نہیں۔''

اسی طرح ایک دن ایک اور صاحب الصدف جنرل سٹور پر وارد ہوئے اور فی الفور ایک کیسٹ ریکارڈ کرانے کا مطالبہ کیا تو عطاء نے اپنے چھوٹے بھائی ثناء اللہ خان سے کہا:

''شنو! کدھر رکھا ہے وہ ایکسرے۔ذرا لالا کو دکھاؤ نہ۔''

ثناء اللہ ایکسرے لانے کے بہانے باہر چلا گیا تو عطاء نے ایک درد بھری آہ بھر کر کہا'' کیا بتاؤں لالا کل ہی ایکسرے کرایا ہے۔دو سوراخ دائیں پھیپھڑے میں ہیں، دو بائیں پھیپھڑے میں۔ڈاکٹروں صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو یہ گانے بجانے کا دھندا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دو۔مجبوری ہے لالا ورنہ تمہاری فرمائش فوراً

پوری کر دیتا۔ یہ سن کر وہ صاحب سخت نادم ہوئے کہنے لگے ''میں شرمندہ ہوں لالا۔ مجھے تمہاری حالت کا علم نہ تھا۔ خدا تمہیں صحتِ کامل عطا فرمائے۔''

صوفی عمر خان

ایک دن روکھڑی کے علاقے سے عمر خان نامی ایک نوجوان آیا۔ قد وقامت اور صحت قابلِ رشک۔ چہرے پر معصوم سی داڑھی، باتوں میں عجیب بھولپن۔ کہنے لگا۔

تمہاری طرح میں بھی بہت دکھی ہوں لالا کھیتی باڑی کا کام کرتا تھا۔ ایک بیل مر گیا۔ دوسرا ہل کا پھالا لگنے سے لنگڑا ہو گیا۔ پانچ سو روپے میں بڑی مشکل سے بیچا۔ میرے لیے اب دنیا میں کیا رہ گیا تھا۔ والدین اور بہن بھائی تو ہیں، میری ان سے میری کبھی بنتی نہیں۔ بے حس لوگ ہیں سارے کے سارے اس لیے میں نے سوچا کہ تمہاری طرح میں بھی موسیقی کے ذریعے ساری دنیا کو اپنے دکھوں میں شریک کرلوں۔ لہٰذا آج سے تم میرے استاد، میں تمہارا شاگرد۔

صوفی عمر خان تقریباً ایک مہینہ عطاء کے پاس مقیم رہا۔ موسیقی تو بھولا بھالا انسان کیا سیکھتا، البتہ خدمتِ استاد میں اس نے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ان دنوں عیسیٰ خیل میں پانی کی قلت تھی۔ صبح سویرے عمر خان دو گھڑے سر پر اور ایک گھڑا بغل میں لے کر پانی لانے کے لئے دریا کی طرف روانہ ہوتا تو اس کی سادگی اور سعادت مندی دیکھ کر ہنسی بھی آتی اور رونے کو بھی جی چاہتا۔

کچھ عرصہ بعد عطاء نے اسلام آباد میں سکونت اختیار کر لی تو صوفی عمر خان بھی ساتھ جانے کو تیار ہو گیا، مگر اچھا ہوا کہ اس کے گھر والوں کو عیسیٰ خیل میں اس کے ٹھکانے کا علم ہو گیا اور وہ آ کر بڑی منتوں خوشامدوں سے اسے منا کر واپس اپنے گھر لے گئے۔

چچا جان اور عطاء کے احباب

جب کبھی عطاء دکان کے لئے سامان خریدنے لاہور جاتا، یہ کسی اور کام سے باہر جاتا تو جنرل سٹور کا کام اس کے والد محترم سنبھالتے۔ اور محفل شب کے بہت سے رفیقوں کی چھٹی ہو جاتی۔ شفاء کی تو وہ صورت ہی دیکھنے سے بیزار تھے۔ ماسٹر وزیران کے سخت گیر ناصحانہ رویے کی وجہ سے ان کے سامنے زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکتے۔ خدا جانے کیوں وہ ماسٹر

صاحب کی ہر بات کی مخالفت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اگر ماسٹر صاحب کہتے کہ آج موسم خوشگوار ہے تو چچا جان جھنجلا کر کہتے ''تمہیں کیا پتہ اللہ کے کاموں کا۔ ہوسکتا ہے کہ چند منٹ کے بعد موسلا دھار بارش شروع ہو جائے۔ ایسی بے وقوفی کی باتیں نہ کیا کرو۔

اگر ماسٹر صاحب کہتے کہ زمانہ بہت خراب ہو گیا ہے تو چچا جان فوراً ٹوکتے ''زمانے کو برا نہ کہو ماسٹر۔ برے کو سب ہی برے نظر آتے ہیں۔ ساری دنیا کو اپنے جیسا نہ سمجھو۔''

اور اگر ماسٹر صاحب بیچارے زمانے کو اچھا کہتے تو چچا جان بھڑک اٹھتے۔

''تم کیا جانو ان باتوں کو اتنا برا زمانہ تو کبھی آیا ہی نہیں مگر تمہیں ان باتوں کا احساس کیوں ہونے لگا۔ جب تک باپ زندہ ہے عیاشی کیے جاؤ، بعض میں دیکھا جائے گا۔''

خدا کی مہربانی سے عطاء کے دوستوں میں ایک میں ہی تھا جس کے ساتھ چچا جان کا رویہ ہمیشہ بے حد مشفقانہ رہا اور بحمد للہ آج بھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں نے آج تک چچا جان کی کسی بات کی تردید یا مخالفت کرنے کی جسارت نہیں کی۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میرے نام کے ساتھ پروفیسر کا لقب منسلک ہونے کی وجہ سے وہ مجھے خاصا معزز اور شریف آدمی سمجھتے ہیں۔ بہر حال اللہ کا کرم ہے کہ آج تک وہ مجھے نہایت محبت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور چچا جان کے مزاج سے واقفیت رکھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ یہ معمولی اعزاز نہیں۔

چچا جان کی اس خصوصی شفقت کی وجہ سے میں عطاء کی عدم موجودگی میں بھی الصدف جنرل سٹور پر باقاعدگی سے حاضری دیتا۔ چچا جان بڑی محبت سے پیش آتے۔ میرے لیے چائے منگواتے پھر تازہ اخبار کی روشنی میں ہم دونوں حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے اور اس کے بعد شام تک کا بقیہ وقت عطاء کے نالائق دوستوں کو کوسنے میں صرف کرتے۔ میں چچا جان کی اس رائے سے سو فیصد اتفاق کرتا کہ یہ سب کے سب لوگ ناکارہ اور اصلاح طلب ہیں۔

''کیا بتاؤں چچا جان'' میں کہتا ''اگر میرا بس چلے تو ان سب کو کچھ عرصہ کے لیے پاگل خانہ میں داخل کرا دوں۔''

چچا جان میری اس دانش مندانہ بات پر اتنے خوش ہوتے کہ فوراً مزید چائے منگواتے۔ اور یوں یہ سلسلہ دن بھر جاری رہتا۔

عطاء کے دوستوں سے چچا کی بیزاری کچھ ایسی بلا وجہ نہ تھی۔ دراصل چچا جان اس زمانے میں عطاء کے مستقبل کے بارے میں بے حد فکر مند تھے وہ چاہتے تھے کہ عطاء عیسیٰ خیل کی افلاس زدہ فضاء سے باہر نکل کر کوئی معقول اور باعزت ذریعہ معاش تلاش

کرے مگر اس کے دوستوں کا اصرار اس بات پر تھا کہ عطاء عیسیٰ خیل ہی میں رہے۔ اگر چہ چچا جان کی موجودگی میں تو ہم میں سے کوئی بھی یہ بات کہنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا مگر دل سے ہم سب یہی چاہتے تھے کہ عطاء ہم سے کبھی جدا نہ ہو۔

عطاء کے شوقیہ گلوکاری کے بارے میں چچا جان کا رویہ شروع میں بہت سخت تھا۔ سرِ شام میکدہ میں احباب جمع ہوتے محفل موسیقی کا آغاز ہوتا، مگر عشاء کی اذان ہوتے ہی بتیاں بجھا کر سب لوگ ادھر ادھر ہو جاتے کیونکہ اس وقت چچا جان قریبی مسجد میں نماز پڑھنے کیلئے گھر سے نکلتے اور اگر ہارمونیم کی آواز ان کے کان میں پڑ جاتی تو سب کی شامت آ جاتی۔ لہٰذا اذان کی آواز بلند ہوتے ہی میکدے میں بتیاں بجھا دی جاتیں۔ کوئی صاحب چارپائی کے نیچے پناہ لیتے، کچھ لوگ دیوار پھاند کر ادھر ادھر کی گلیوں میں بکھر جاتے۔ چچا جان میکدے کے دروازے پر آتے۔ دروازہ مقفل نہ پا کر غصے کا اظہار کرتے۔

''کم بخت دروازہ کھلا ہی چھوڑ جاتے ہیں۔''

دروازے کو باہر سے تالا لگاتے اور مسجد چلے جاتے۔

جب وہ نماز پڑھ کر واپس آتے اور گھر میں داخل ہو جاتے تو گلیوں میں بکھرے ہوئے احباب ڈرتے ڈرتے واپس آتے اور میکدے کے ساتھ والے کمرے کے دروازے پر آہستہ سے دستک دیتے۔ اندر پڑے ہوئے احباب میں سے کوئی صاحب اندر سے دروازہ کھولتے اور یوں آہستہ آہستہ سب لوگ دوبارہ جمع ہو جاتے اور محفل پھر سے جم جاتی۔

یہ معمول ایک عرصہ تک چلتا رہا۔ مگر عشق اور مشک کی طرح موسیقی بھی چھپنے چھپانے والی چیز نہیں۔ ان محفلوں کا علم بھی چچا جان کو بہت جلد ہو گیا۔ ایک آدھ مرتبہ انہوں نے احباب کو عین موقع پر پکڑ کر لعنت ملامت بھی کی مگر نصیحت کا اثر نہ ہوتے دیکھا تو انہیں لاعلاج سمجھ کر نظر انداز کر دیا اس کے باوجود ان کی ناراضگی کا خوف دلوں پر بدستور طاری رہا۔ اور ہر شب عشاء کی اذان کے بعد ایک آدھ گھنٹہ کے لیے میکدے میں بتیاں تو نہ بجھائی جاتیں مگر سب احباب چپ چاپ، باادب، باملاحظہ ہوشیار، سراپا شرافت بن کر بیٹھے رہتے۔ بعض اوقات آتے جاتے چچا جان میکدے کا دروازہ کھول کر حاضرین کو ایک نظر دیکھ بھی لیتے۔ دیکھنے کا مقصد یہ ہوتا کہ کہیں شفاء تو اس محفل میں نہیں گھس آیا۔ مگر شفاء بہت سمجھدار آدمی ہے وہ ہمیشہ اس وقت آتا جب چچا جان اپنے بستر میں آرام سے سو رہے ہوتے۔

عطاء کے احباب کا فرداً فرداً تعارف کرانے کی بجائے صرف یہی کہہ دینا کافی ہو گا کہ

ے رانجھا ہر کیں دا سانجھا

اس کے احباب کی تعداد بلا مبالغہ اتنی بڑی ہے کہ ہر ایک کا تعارف فقط ایک فقرے میں کرایا جائے تو پھر بھی ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب بن جائے۔ مگر میری مجبوری سمجھئے یا نالائقی کہ میرے تمام تر علم الاحباب اپنے ضلع کے ننھے سے دائرے میں محدود ہے اور عطاء کی شناسائی بہار کی ہوا کی طرح پورے کرہ ارض کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ہوا کے تعاقب میں کوئی کہاں تک مارا مارا پھرتا رہے؟ اس لئے فی الحال تعارف انہی احباب کا کرا سکتا ہوں جو میرے محدود علم کی دسترس میں ہیں۔

احبابِ میکدہ میں سے بیشتر لوگوں کا تو مفصل تعارف بر سبیل تذکرہ کہیں نہ کہیں ہو گیا۔ یہاں ذکر چند ایسے دوستوں کا ہو گا جو عطاء کے میکدے سے باہر کی زندگی میں ہمدم و ہم راز رہے اور اب تک ہیں۔ عیسیٰ خیل میں عطاء کے بعض احباب ایسے ہیں جو میکدے کے اندر اور باہر دونوں جگہ اس کے ساتھ رہے۔۔۔۔ ان میں سرِ فہرست نام اعجاز خان کا ہے اعجاز خان عطاء کے قریبی رشتہ دار اور تقریباً ہم عمر ہیں۔ نہایت خوبرو نوجوان ہیں اور اپنی خوبروئی سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دل کے معاملات میں اکثر ملوث رہتے ہیں۔ ایسے معاملات میں عطاء کے مشیرِ خصوصی یہی ہیں۔ لہٰذا جو راز ہائے سر بستہ ان کی تحویل میں ہیں کسی اور دوست کی دسترس میں نہیں۔

امتیاز خان ماشاءاللہ اب تو خاصے گرانڈیل نوجوان ہیں۔ میرے عیسیٰ خیل میں قیام کے زمانے میں بمشکل دس بارہ برس کے ہوں گے۔ عطاء کے ماموں زاد نہایت لاڈلے بھائی ہیں۔ میکدے میں تو یہ اپنی کم سنی کے باعث رکنیت حاصل نہ کر سکے مگر الصدف جنرل سٹور پر دن بھر اپنے بڑے بھائی (عطاء) کے گرد منڈلاتے رہتے تھے۔ عطاء سے ان کی محبت عشق کی حد تک جب بھی تھی، اب بھی ہے۔

لالا فدا میکدے کے مستقل رکن ہیں۔ کم گو، مگر نہایت خوش اخلاق۔ تبسم کی ایک ہلکی سی دلنشین لکیر ان کے چہرے سے غائب ہوتی کبھی نہ دیکھی۔ لالا فدا میکدے کے ارکان میں سے واحد شخصیت ہیں جن کا دل ہمیشہ ان کے اپنے پہلو میں رہا۔ ایک دل کس کس کو دیں۔ ایک فدا اور اتنے محبوب۔ میکدے سب مے خوار ان کے محبوب اور یہ ہر وقت ان کی خدمت پر کمر بستہ۔

عتیل عیسیٰ خیلوی اپنی علم دوستی اور بلند پایہ ادبی ذوق کے باعث اہلِ میکدہ میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ امیر خسرو سے لے کر پروین شاکر تک نہ صرف ہر شاعر کا مکمل کلام، بلکہ ہر شاعر اور شاعرے کے بارے میں آج تک جو کچھ لکھا گیا، ان کی ذاتی لائبریری کی

زینت ہے۔ اخباروں کے تراشے تک نہایت سلیقے سے محفوظ۔ بیشتر کلاسیکل شعراء کے بارے میں ہماری معلومات ان کی ذاتی لائبریری کی مرہونِ منت ہیں۔ نقوش، ادبِ لطیف اور فنون جیسے مقتدر جرائد کے تمام خصوصی شمارے وہیں ہماری نظر سے گزرے۔ ادب کے علاوہ دست شناسی پر بھی ہر قابلِ ذکر کتاب عتیل کی زنبیل میں موجود تھی۔ مگر شکر ہے کہ ہم اس چسکے سے محفوظ رہے ورنہ کسی اور کام کے نہ رہتے۔ عتیل سے ان کے ذوق کے بارے میں پوچھئے تو شرما کر کہتے ہیں۔

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے دست شناسی

عتیل نہ صرف تین کتابوں (گلِ دشت، رشتۂ درد اور شعرِ سخن) کے مصنف ہیں بلکہ فن کتابت میں بھی خاصی دسترس رکھتے ہیں۔ عطاء کے نہایت بے تکلف دوست ہیں۔ دونوں جب کبھی لہر میں ہوں تو ان کی نوک جھونک سننے کے قابل ہوتی ہے۔ حضرت عتیل غصے میں ہوں تو خود کو ایسی ایسی چمکدار نادر و نایاب گالیاں دیتے ہیں کہ سامعین کے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔

خداداد خان ڈرائیور دن کو بس ڈرائیوری کرتے اور رات کا بیشتر حصہ میکدے میں گذارتے نہایت ہنس مکھ اور ملن سار آدمی تھے۔ عرصہ ہوا تلاشِ معاش میں متحدہ عرب امارات گئے تھے۔ جب تک میں عیسیٰ خیل میں رہا تب تک وہ واپس نہیں آئے تھے۔۔

ملازم حسین عرف ماجا، عطاء کے مستقل طبلہ نواز تھے۔ گورنمنٹ ہائی سکول عیسیٰ خیل میں ملازم ہیں لوگ گیتوں کے ساتھ سنگیت میں ماجہ کا سا منفرد انداز کم ہی سننے میں آتا ہے۔ درویش صفت آدمی ہیں۔ فن کا سچا ذوق رکھتے ہیں۔

خدوزی تحصیل عیسیٰ خیل کے غلام دستگیر ہاشمی اور فاروق ہاشمی عطاء کے قریب ترین ساتھیوں میں سے ہیں۔۔۔ فاروق ہاشمی (فاروق قریشی) کندیاں میں ٹھیکیداری کرتے ہیں اور مستقل طور پر وہیں مقیم ہیں۔ عطاء اکثر و بیشتر ان کے ہاں جاتا اور موسیقی کی محفلیں سجتیں۔ عطاء کی کندیاں آمد و رفت اتنی زیادہ تھی کہ فاروق قریشی کی بیٹھک کو میکدے ہی کا ایک کمرہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ خلوص اور محبت کی جو فراوانی دستگیر اور فاروق کے ہاں دیکھی کہیں اور شاید ہی دیکھنے کو ملے۔ عطاء اب بھی جب کبھی عیسیٰ خیل یا میانوالی آتا ہے تو لالا فاروق سے ملنے کندیاں ضرور جاتا ہے۔

میانوالی کے عصمت گل عصمت خوبرو، خوش اخلاق اور خوش سخن نوجوان ہیں۔ شعر بہت عمدہ کہتے ہیں۔ میانوالی میں عطاء کا ایک ٹھکانہ عصمت کا دولت کدہ بھی ہے۔ عصمت کی عطاء سے محبت کا مرکز اس کے فن سے زیادہ اس کی دل آویز شخصیت ہے۔۔۔

عصمت کالج میں میرے شاگرد بھی رہے ہیں۔پچھلے سال انہوں عطاء کے ساتھ شہزاد ہوٹل میانوالی میں ایک خوبصورت شام کا اہتمام کیا۔اور یوں عطاء کے بے شمار شیدائیوں کی دعائیں اپنے نامہ اعمال میں جلی سرخیوں میں درج کروائیں۔ایک موقع پر میرے اور عطاء کے درمیان رنجش پیدا ہوئی تو عصمت کی بے تابی دیکھی نہ جاتی تھی۔

ادب،صحافت اور سیاست میں بیدوقت طبع آزمائی میں بھی محمد منصور آفاق کا کچھ نہیں بگاڑا۔مگراس سے بھی بڑا کمال یہ ہے کہ منصور نے ادب،صحافت اور سیاست کا کچھ نہیں بگاڑا۔حالانکہ وہ خاصا جذباتی اور جوشیلا نوجوان ہے اور کھڑکار پسند ہے۔مگر مؤثر کھڑکار کے لئے چونکہ وسائل چاہئیں جو بد قسمتی سے ہمارے ہاں مستحق لوگوں کی دسترس سے ہمیشہ باہر رہتے ہیں۔اس لئے منصور اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود ابھی تک دریافت نہیں ہوسکا۔موسیقی منصور کی کمزوری کبھی نہیں بن سکی۔مگر عطاء کی شخصیت کے جادو سے یہ بھی نہ بچ سکا۔

اقبال الدین شاہ جنہیں بعض دوست پیار سے بھالا شاہ کہتے ہیں۔میانوالی کے ایک معزز گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔۔۔۔شاہ جی نہایت دلچسپ آدمی ہیں۔ہنسنے اور ہنسانے میں ان کا جواب نہیں۔عطاء سے ان کے اکثر مکالمے نہایت چٹ پٹے ہوتے ہیں اتنے چٹ پٹے کہ لکھے بھی نہیں جاسکتے۔عطاء سے ان کی دوستی ان دنوں سے ہے جب میکدہ آباد تھا۔

اس زمانے کے بہت سے دوستوں کے اب نام یاد نہیں آرہے۔ان سب سے معذرت خواہ ہوں اور یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اس کوتاہی کی تلافی بہت جلد کردوں گا۔

سائیکل+اونٹ گاڑی=مزدا ۹۲۹

۶۹۔۱۹۶۸ء میں جب پاکستان پیپلز پارٹی میدانِ عمل میں آئی تو پارٹی کے خوش آئند منشور نے متوسط طبقہ کے نوجوانوں کو فی الفور متوجہ کیا اور روٹی،کپڑا اور مکان کے نعرے چارسو گونجنے لگے۔

ضلع میانوالی میں پیپلز پارٹی کو حبیب اللہ خان آف رھلہ عظمت خان والا نے متعارف کرایا۔مرحوم حبیب اللہ خان کے بھٹو صاحب سے ذاتی مراسم تھے۔اور پارٹی کے ان کی خدمات کے بھٹو صاحب بے حد معترف تھے۔

میانوالی میں پارٹی کی مقبولیت بڑھتے بڑھتے عیسیٰ خیل تک پہنچی تو سب سے پہلے

عطاء نے عیسیٰ خیل میں جیئے بھٹو کا نعرہ بلند کیا۔ عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی اس زمانے میں عطا شاہین کہلاتا تھا۔ عطاء اللہ خان شاہین نے نوجوانوں کا ایک اچھا خاصا سرگرم گروہ منظّم کر کے پارٹی کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کا کام شروع کر دیا۔ پارٹی کے لئے اس کی خدمات کے صلے میں اسے پارٹی کی صوبائی قیادت کی طرف سے ایک عدد سہراب سائیکل عطا ہوئی، جو ایک عرصہ تک اس کی ہم سفر رہی۔

سہراب سائیکل سے مزدا ۔۹۲۹ تک کا سفر عطاء نے پیدل طے کیا۔ مگر کچھ اس تیزی سے طے کیا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے کہاں وہ زمانہ کہ عطاء کو کہیں جانا ہوتا تو موٹر سائیکل کی سواری کے لئے احباب کا مرہونِ منت ہونا پڑتا۔ اور کہاں یہ دور کے صرف ایک کیسٹ ریکارڈ کرنے کے لئے کراچی کے ایک صاحب نے چمکتی دمکتی نئی ہونڈا اکارڈ عطا کی نظر کر دی۔

ناداری کے صبر آزما دور کا ایک دلچسپ واقع سنئے۔ ایک دفعہ عطاء نے کسی نہایت ضروری کام کے سلسلے میں کندیاں جانا تھا تو ایک صاحب سے موٹر سائیکل منگوائی۔ موٹر سائیکل بھیجنے سے تو وہ صاحب انکار نہ کر سکے، مگر موٹر سائیکل کی ٹینکی سے پٹرول کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا۔ اس زمانے میں چونکہ عیسیٰ خیل میں کوئی پٹرول پمپ نہ تھا لہٰذا انہوں نے سوچا ہوگا کہ عطاء چار و ناچار موٹر سائیکل جوں کی توں واپس بھیج دے گا۔ ادھر عطاء کی مجبوری یہ تھی کہ اسے شام سے پہلے بہر حال منزل مقصود پر پہنچنا تھا۔ عطاء کی جگہ کوئی اور ہوتا تو تھک ہار کر بیٹھ جاتا مگر عطاء کے ذہنِ رسا نے فی الفور ایک انوکھی ترکیب ڈھونڈ نکالی۔ عطاء نے اپنے جنرل سٹور سے سگریٹ لائٹر آئیل کی درجن بھر بوتلیں اٹھا کر موٹر سائیکل کی ٹینکی میں الٹ دیں۔ اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے چلتا بنا۔

اپنی سواری نہ ہونے کے اس دور میں ایک دفعہ احبابِ میکدہ کو کلوانوالہ میں ایک دوست نے کھانے پر مدعو کیا۔ ہم لوگ پریشان تھے کہ سات آٹھ آدمیوں کا یہ قافلہ کلوانوالہ کس طرح پہنچے گا۔ عطاء نے یہ مسئلہ حل کر دیا ایک دوست سے اونٹ گاڑی مانگ لایا۔ ہمیں اس پر بٹھایا۔ سٹیرنگ (اونٹ کی مہار) خود سنبھالی، اور نہایت چابک دستی سے ڈرائیونگ کرتا ہوا ہمیں کلوانوالہ لے گیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ آتے جاتے، راستے میں ''چولا چکنے دا'' والا گیت بھی سناتا رہا۔ ایک دو منچلے دوستوں نے اونٹ گاڑی میں اس گیت پر رقص کرنے کی کوشش بھی کی، مگر اونٹ نے گردن گھما کر قہر آلود نگاہوں سے اس طرح دیکھا کہ جیسا کہہ رہا ہو ''گیت کا مزا خراب نہ کرو یار!'' ۔۔۔ تو وہ حضرات دم سادھ کر بیٹھ گئے۔

کہ درویشی بھی عیاشی ہے۔۔۔۔۔

ہمارے ایک دوست کے پیرو مرشد عیسیٰ خیل تشریف لائے تو ان کے اعزاز میں ایک خصوصی تقریب منعقد ہوئی۔ جس میں عطاء نے ان کی خدمت میں اپنے فن کا نذرانہ پیش کیا۔ پیر صاحب تیس پینتیس برس کے خوبرو خوش طبع نوجوان تھے۔ تقریب کے آغاز میں تو ہم سب لوگ نہایت باادب اور باملاحظہ ہوشیار رہے، مگر عطاء کی گلوکاری کے دوران پیر صاحب کی حرکات وسکنات دیکھ کر ادب اور ملاحظہ تو رخصت ہو گئے صرف ہوشیاری باقی رہ گئی۔ محفل کی ترتیب کچھ یوں تھی کہ ایک چھوٹے سے کمرے میں ایک جانب پیر صاحب ایک چارپائی پر گاؤ تکیہ لگائے تشریف فرما تھے۔ ان کے سامنے دری پر ہم سب لوگ ہاتھ باندھے بیٹھے تھے۔ ہاتھ باندھنے کی شرط سے عطاء اور ملازم حسین آزاد تھے کیونکہ عطاء گا رہا تھا اور ملازم حسین طبلہ پر سنگت کر تھا۔ شروع میں تو پیر صاحب کی تمام تر توجہ عطاء اور اس کے فن پر رہی اور "واہ واہ، کیا بات ہے" کہہ کر داد دیتے رہے، مگر پھر اچانک ان کی نگاہ جوہر شناس ایک حسین چہرے پر پڑی اور وہ ادھر ہی کے ہو کر رہ گئے۔ میرے ایک طرف وہ حسین چہرہ اور دوسری طرف اس کے والد محترم تشریف فرما تھے۔ پیر صاحب کی اس چہرے پر مسلسل یہ عنایت دیکھ کر مجھے یہ ڈر تھا کہ اس کے والد بزرگوار پیر صاحب کی ضرورت سے زیادہ توجہ سے بدگمان ہو کر پیر صاحب کو ان کی خوبصورت گھنگھریالی زلفوں سے پکڑ کر وہیں فرش پر گھسیٹنا شروع کر دیں۔ لہٰذا میں سرک کر اس طرح بیٹھ گیا کہ وہ چہرہ پیر صاحب کی نگاہوں سے اجھل ہو گیا پیر صاحب نے ایک قہر آلود نظر مجھ پر ڈالی مگر شکر ہے کہ منہ سے کچھ بولے نہیں، ورنہ شرفا کا یہ باوقار اجتماع کسی پنجابی فلم کا آخری سین بن جاتا۔

محفل ختم ہوئی اور بیشتر احباب رخصت ہو گئے تو پیر صاحب کے ساتھ ایک بے تکلف نشست ہوئی جس کے دوران انہوں نے اپنی سرگرمیوں کی تفصیل بتاتے ہوئے اپنا بریف کیس کھولا اور مختلف حسین چہروں کی درجنوں تصاویر نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیں اور پھر آہ بھر کر عطاء سے کہنے لگے "یار یہ تمہارے والا ہنر اگر میرے پاس ہوتا تو اپنے وارے نیارے ہو جاتے"۔ (تصویریں تمام صرف مردانہ چہروں کی تھیں)۔

تقریباً ایک گھنٹہ تک پیر صاحب کی دلچسپ باتیں سننے کے بعد ہم ان سے رخصت ہوئے تو راستے میں ان کے سادہ لوح مریدوں کے مستقبل پر غور کرتے رہے۔ مگر افسوس کہ ہمارے غور کرنے کے باوجود ان بیچاروں کا مستقبل تاریک ہی نظر آتا تھا۔ البتہ اس خیال سے کچھ اطمینان نصیب ہوا کہ مستقبل پیر صاحب کا بھی ان سے کچھ

مختلف نہ ہوگا۔

پیر صاحب دو تین دن عیسیٰ خیل میں مقیم رہے۔ ان دو تین دنوں میں عطا تو باقاعدگی سے ان کی خدمت میں حاضری دیتا رہا مگر ہمیں دوسری بار حاضرِ خدمت ہونے کی سعادت نصیب نہ ہو سکی۔

گھر آئے مہمان

ایک دفعہ ہمارے کسی عقیدت مند نے ایک بھاری بھر کم مرغ ہماری نذر کیا تو ہم نے سوچا کہ احباب کے ممنون کرنے کا اس سے بہتر موقع پھر کہاں نصیب ہوگا۔ لہٰذا ہم نے عطاء، شفاء اور ماسٹر وزیر کو شام کے کھانے کی دعوت دے دی۔

تقریباً عصر کے وقت یہ تینوں حضرات ہماری خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا ''لالا ہم ذرا کم مشانی تک جا رہے ہیں۔ واپسی میں ایک آدھ گھنٹہ تاخیر ہو جائے تو فکر نہ کرنا''۔

ہم نے بخوشی انہیں جانے کی اجازت دے دی اور خود دعوت کی تیاریوں میں لگ گئے۔

شام ہوئی، رات ہوئی۔۔۔۔ دس بجے تک انتظار کرنے کے بعد ہم معزز مہمانوں کی سات پشتوں کو جی بھر کر کوسنے کے بعد لمبی تان کر آرام سے سو گئے۔

ٹھیک ڈیڑھ بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم آنکھیں ملتے ہوئے باہر نکلے تو تینوں مہمان مجرموں کی طرح سر جھکائے معافیاں مانگ رہے تھے۔

''معاف کر دو لالا ذرا دیر ہو گئی'' عطاء نے بڑی عاجزی سے کہا ''مگر ہم اپنے قصور کی تلافی ابھی کئے دیتے ہیں۔ وہ یوں کہ کھانا جیسا ہے جس حال میں ہے یہیں گلی میں لے آؤ۔ ہم یہیں بیٹھ کر کھا لیتے ہیں۔ اور خبردار اس وقت گھر والوں کو جگا کر کھانا گرم کرنے کی زحمت نہ دینا۔ ڈرائینگ روم کھولنے کی بھی اجازت نہیں کیونکہ اس طرح شور ہوگا اور بچے جاگ اٹھیں گے تو کیا کہیں گے کہ کیسے لفنگے چاچوؤں سے واسطہ پڑا ہے۔

ہم معزز مہمانوں کی دلشکنی کرنا گوارا نہ کیا اور ان کی فرمائش حرف بہ حرف پوری کر دی۔ ٹھنڈا یخ سالن، گتے جیسی خشک روٹیاں اور منجمد حلوا ان حضرات نے گلی کے فرش پر بیٹھ کر کھایا اور ہمیں دعائیں دیتے رخصت ہو گئے۔

سیما بہن ! ہم تم کو نہیں بھولے

عطاء کی بہن سیما کی ناگہانی موت عطاء کی زندگی کا سب سے بڑا سانحہ تھی۔ سیما عطاء سے دو تین سال چھوٹی تھی۔ اپنی ذہانت، خوش مزاجی اور غم گساری کی وجہ سے اپنے کنبے کی آنکھوں کا تارا تھی۔ خاص طور پر عطاء کے والد محترم تو سیما کے مشورے کے بغیر گھریلو معاملات کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور ان کی یہی جذباتی عطاء سے ان کی ناراضگی کا کبھی سوال ہی پیدا نہ ہونے دیتی، کیونکہ سیما کی عطاء سے بے پناہ محبت ہر نازک وقت میں ابو کے غیض وغضب کو ایک بے بس تبسم میں بدل دیتی۔

''خبردار ابو! سیما بڑے مان سے کہتی، میرے بھائی کو کچھ ہو گیا تو عمر بھر آپ سے نہیں بھولوں گی۔''

اور سیما کی یہ معصوم دھمکی ہمیشہ کارگر ثابت ہوتی۔ چہیتی بیٹی کا روٹھنا انہیں کسی قیمت پر گوارا نہ تھا۔ شاید ان کے دل کی گہرائیوں میں کسی جگہ یہ سچا خوف پنہاں تھا کہ سیما اگر ایک بار روٹھ گئی تو پھر کبھی لوٹ کر نہ آئے گی۔

ابو کا یہ خوف کتنا سچا تھا۔ سیما کی زندگی چراغِ آخرِ شب کی لرزتی لو ثابت ہوئی۔

خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود

موت کے بے رحم ہاتھوں نے یہ چراغ سحر سے بھی کچھ پہلے گل کر دیا۔ سیما بس چند روز گردے کے مرض میں مبتلا رہ کر اپنے تین ننھے منے بچوں کو بلکتا چھوڑ کر اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئی۔ ننھا اصغر رزاق ماں کی جدائی کا صدمہ برداشت نہ کر سکا اور چند ہی روز بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ماں کی آغوش میں جا سویا، اصغر کی لوحِ مزار کے لئے عطاء نے کچھ لکھنے کو کہا تو آنکھوں سے اُمڈتے آنسو مجھ سے چھپانے کے لئے منہ پھیر لیا۔ مگر میری آنکھوں میں لرزتے ہوئے آنسو لفظوں میں ڈھل کر درج ذیل قطعہ کی صورت میں صفحہ قرطاس پر بکھر گئے۔

ایک اُجڑے ہوئے گلشن کے گل نورستہ
تو نے کس خوف کے مارے یہ جہاں چھوڑ دیا
آہ! کیا تلخ حقیقت ہے ترا یوں جانا
کٹ گئی شاخ تو غنچے نے بھی دم توڑ دیا

سنگ مرمر کی ننھی سی تختی پر کندہ، یہ قطعہ اصغر کی ننھی سی قبر پر نصب ہے۔

بہن کی قیمتی جان بچانے کے لئے عطاء نے کیا کچھ نہ کیا۔ سیما کی بیماری کے آخری دنوں میں ڈاکٹروں نے اس کی جان بچانے کے لئے خون کا عطیہ طلب کیا تو عطاء نے اپنے

نحیف ونزار جسم سے ڈھیر سارا خون بھی دیا۔اس موقع پر ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال میانوالی میں عطاء کے چند عزیزوں کے ساتھ میں بھی موجود تھا۔خون دینے کے بعد عطاء کے جسم میں اتنی سکت بھی نہ رہی کہ اپنے پاؤں پر چل کر تانگے تک پہنچ سکتا۔ہم لوگ اسے سہارا دے کر تانگے تک لائے اور وہ تانگے کی پچھلی نشست پر لیٹ کر بہ صد مشکل اپنی قیام گاہ تک پہنچا۔

ادھر چارہ گری کے یہ ترلے ہو رہے تھے،اور ادھر سیما کی رخصتی کا حکم جاری ہو چکا تھا۔کسی کی کیا مجال جو موت کی ڈولی کو خالی واپس لوٹا دے۔یا لمحہ بھر کو روک ہی لے، بھائی کے شہ رگ کے خون کی توانائی بھی بہن کو موت کی گرفت سے نہ چھین سکی اور اسی رات کی ایک مہلک ساعت سیما کو اپنے ہمراہ لے کر سرحدِ زیست کے اُس پار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی۔

سیما کی موت کا زخم عطاء کے سینے میں آج بھی ہرا ہے۔اسی لئے وہ ''لالا جاگ'' والا گیت نہ گا سکتا ہے،نہ سن سکتا ہے۔

لالا جاگ والا گیت ہمارے علاقے کا وہ لوک گیت ہے جو بہنیں اپنے بھائیوں کی شادی کے موقع پر رات کے پچھلے پہر گا کر انہیں نیند سے جگاتی ہیں اور ان کے ہاتھ پاؤں میں مہندی لگا کر انہیں دولہا بناتی ہیں۔بہن کی پاکیزہ محبت کا اظہار اس شعر کی صورت میں جس خلوص، پیار اور سادگی سے اس گیت میں کیا گیا ہے اس کی مثال کہیں اور ملنا ناممکن ہے۔

عطاء کی پہلی شادی ہوئی تو یہ گیت گانے والی ٹولی کی قیادت سیما ہی نے کی اور اسی نے اپنے ہاتھوں سے عطاء کے ہاتھ پاؤں میں مہندی لگائی۔

سیما کے شوہر عبدالرزاق خان ملازمت کے سلسلہ میں ایک عرصہ تک گجرات میں مقیم رہے۔یوں شادی کے بعد سیما کی زندگی کا بیشتر حصہ گجرات میں بسر ہوا۔

عطاء بہن سے ملنے اکثر گجرات جاتا اور ادھر ہی کا ہو کر رہ جاتا۔واپسی کے لئے والدین کا اصرار جب ناراضگی کی حدوں کو چھونے لگتا تو بادلِ ناخواستہ واپس آجاتا،مگر چند ہی روز بعد کسی نہ کسی بہانے پھر گجرات پہنچ جاتا۔

گجرات میں قیام کے دوران عطاء حسب معمول ہر رات دیر تک نغمہ سرائی کا شغل جاری رکھتا،اس دور میں اس کے گائے ہوئے گیت متعدد کیسٹوں میں محفوظ ہیں۔

سیما کے شوہر بچپن میں میرے ہم درس رہے،سیما کی وفات کے کچھ عرصہ بعد

ایک دن وہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ اور گجرات میں اپنے قیام کے دوران عطاء کے ریکارڈ کیے ہوئے کیسٹ سنوانے لگا۔ ہم ایک کیسٹ سن رہے تھے کہ اس میں سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور پھر پیالیوں کی کھنک سنائی دی۔ رزاق خان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ کیسٹ فوراً بند کرتے ہوئے آہ بھر کر کہنے لگے۔

''یہ آواز سنی تم نے۔ سیما ہمارے لئے چائے بنا کر لائی ہے۔''

اللہ اللہ! سیما اپنے پیچھے کیسی زندہ یادیں چھوڑ گئی۔ وہ یقیناً ان لوگوں میں سے تھی جو مر کر بھی فنا نہیں ہوتے اور کسی نہ کسی روپ میں مسلسل اپنے وجود کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ چاہے وہ روپ پیالیوں کی کھنک ہو یا دروازہ کھلنے کی آواز۔ لتا منگیشکر کا یہ گیت شاید ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ہے۔

رہیں نہ رہیں ہم
مہکا کریں گے
بن کے کلی
بن کے کرن
باد صبا میں

سیما کے آنچل کا سایہ سر سے ہٹا تو عطاء کو پہلی آلام کی اس اذیت ناک تپش کا احساس ہوا، جو ایک عرصہ سے اسی دن کی منتظر تھی۔ اتنے بڑے سانحے کے بعد عطاء کا محض زندہ رہنا ہی ایک معجزے سے کم نہ تھا۔ اس کی شخصیت کی ہری بھری شاخ پر یہ سانحہ بجلی بن کر گرا۔ عطاء کی حالت پاگلوں جیسی ہو گئی۔ اسے دیکھ کر طرح طرح کے ہولناک وسوسوں سے دل لرز لرز جاتے۔

''یہ شخص اس حال میں کب تک جی لے گا؟'' یہ سوال کسی کے لب پر تو نہ آ سکا، مگر ایک ہولناک پرچھائیں کی طرح عطاء کے اردگرد ہر وقت منڈلاتا دکھائی دیتا۔ وہ دن بدن زندگی سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ مایوسی کے تاریک سائے اسے چاروں طرف سے گھیر کر ایک بھیانک منزل کی طرف لے جا رہے تھے۔ ان سایوں کا حصار اتنا مضبوط تھا کہ تسلی اور نصیحت کا کوئی لفظ بھی عطاء تک پہنچانا ناممکن تھا۔ ادھر ہم لوگوں کے خوف و ہراس کا یہ عالم، اور ادھر دور، بہت دور، آسمانوں کی بلندیوں پر یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ غروب کی ان علامات میں سے طلوع کا معجزہ دکھایا جائے گا۔

ڈھلتے سورج کا طلوع

یاس و حرماں کے اس دور میں عطاء کو تونسہ شریف کے سالانہ عرس میں شرکت کی دعوت موصول ہوئی اور ہم سب لوگوں نے مل کر بہ صد مشکل اسے وہاں جانے پر رضامند کر لیا۔ ہمارا یہ اندازہ تھا کہ چند روز گھر سے دور رہ کر اس کی حالت کچھ سنبھل جائے گی مگر یہ اندازہ غلط نکلا۔ وہ تونسہ شریف سے واپس آیا تو اس کی آنکھوں میں یاس کے سائے کچھ اور گہرے دکھائی دیتے۔

اسی دن دوپہر کو ایک صاحب کار میں فیصل آباد سے عیسیٰ خیل وارد ہوئے۔ عطاء کا اتا پتہ پوچھتے ہوئے الصدف جنرل سٹور پر پہنچے۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ عطاء اس وقت گھر پر موجود ہوگا۔ عطاء کے ایک عزیز کے ہمراہ وہاں آئے۔ عطاء اس وقت میکدے میں سویا ہوا تھا۔ اسے جگا کر ان صاحب نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ فیصل آباد میں امین پور بازار میں رحمت گراموفون نامی ادارے کے مالک ہیں اور عطاء کی آواز میں چند کیسٹ ریکارڈ کرنا چاہتے ہیں۔ عطاء نے ان کی مناسب خاطر مدارت کے بعد چند روز بعد فیصل آباد پہنچنے کا فیصلہ کر کے انہیں رخصت کر دیا۔ مگر ہم لوگوں کے تمام تر اصرار کے باوجود وہ یہ وعدہ پورا کرنے کے لئے آمادہ نہ کر سکا۔

چند روز بعد رحمت صاحب عطاء کو اپنا وعدہ یاد دلانے کیلئے ایک بار پھر عیسیٰ خیل پہنچے۔ عطاء نے انہیں ایک اور وعدے سے مطمئن کر کے رخصت کر دیا مگر یہ وعدہ بھی پورا نہ ہوا اور رحمت صاحب کو ایک بار پھر عیسیٰ خیل آنا پڑا۔ مگر اب کی بار وہ وعدہ لے کر جانے کے لئے نہیں بلکہ عطاء کو ہمراہ لے کر جانے کا مصمم ارادہ کر کے آئے تھے۔ کچھ ان کا اصرار، کچھ احباب کی ضد۔ عطاء کو ان کے ہمراہ جانا ہی پڑا۔

عیسیٰ خیل سے فیصل آباد تک کا یہی سفر عطاء کے لئے عالمگیر تعارف اور مقبولیت کا سبب بن گیا۔ چند ہی روز بعد عطاء کے پہلے چار کمرشل کیسٹ منظر عام پر آئے تو خیبر سے کراچی تک تہلکہ مچ گیا۔ بڑے بڑے نامور اور مقبول گلوکاروں کی آوازیں آخر شب کے ستاروں کی طرح آناً فاناً پس منظر کے دھندلکوں میں غائب ہو گئیں۔ گھروں، گلیوں، ہوٹلوں اور گاڑیوں میں ہر جگہ عطاء ہی کی آواز گونجنے لگی۔

اسی ایک آواز کی خاطر لوگوں نے ٹیپ ریکارڈر پلیئر خریدے۔ کیسٹوں کا کاروبار چمک اٹھا۔ جگہ جگہ کیسٹوں کی دکانیں کھل گئیں۔ عطاء کے کیسٹوں کی مانگ اس قدر بڑھ گئی کہ ریکارڈنگ کمپنی دن رات کام کرنے کے باوجود مطلوبہ تعداد میں کیسٹ فراہم نہ کر سکی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے کیسٹوں کا روبار کرنے والے لوگوں نے

اپنے ڈپلی کیٹر خرید لئے اور یوں ایک ایک کیسٹ کی ہزاروں کاپیاں تیار ہو کر مارکیٹ میں آ گئیں۔ ہزاروں لوگوں نے لاکھوں روپے کمائے۔ ای۔ ایم۔ آئی، شالیمار ریکارڈنگ کمپنی، پی ایم سی اور سونک جیسے بڑے اداروں نے عطاء سے براہِ راست رابطہ قائم کر کے دھڑا دھڑ اس کے کیسٹ ریکارڈ کرنے شروع کئے۔ پہلے چار کیسٹ مارکیٹ میں آنے کے ایک ہی ماہ بعد عطاء نے لمبی چوڑی خوبصورت مزدا ۹۲۹ گاڑی خرید لی۔ اور اسلام آباد میں ایک خوبصورت مکان کرائے پر لے کر وہاں منتقل ہو گیا۔ کیسٹوں کی آمدنی میں سے اگرچہ عطاء کو اس کا پورا پورا حق کبھی نہ مل سکا۔ تاہم مختلف تقریبات اور موسیقی کی خصوصی محفلوں سے ہونے والی آمدنی نے عطاء کا معیارِ زندگی خاصا بلند کر دیا۔ اگر وہ انکم ٹیکس کی چوری کا ہنر بھی سیکھ لیتا تو آج کروڑ پتی کہلاتا۔

عطاء کی آواز کی روز افزوں مقبولیت نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے کارپردازوں کو بھی اس کی اہمیت کا احساس بہت جلد دلا دیا اور ادھر سے بھی پے در پے بلاوے آنے لگے۔ عطاء جب پہلی بار ریڈیو کے لئے ریکارڈنگ کرانے گیا تو ریڈیو سٹیشن کے ڈائریکٹر صاحب نے اپنے کمرے سے باہر آ کر عطاء کا استقبال کیا۔ آڈیشن Audition کے تکلفات میں پڑے بغیر عطاء کو گریڈ اے کا گلوکار قرار دیا گیا۔ ٹیلی ویژن کے ایک پروڈیوسر کا کہنا ہے کہ ٹیلی ویژن کی دنیا میں عطاء کو وی آئی پی (اہم ترین شخصیت) شمار کیا جاتا ہے۔

نامور اداکار خیام سرحدی نے رم جھم کے عنوان سے راولپنڈی، کراچی، لاہور، فیصل آباد اور سرگودھا میں عطاء کے کئی شو منعقد کئے۔ مختلف مقامات پر فائیو سٹار ہوٹلوں میں عطاء کے کئی شو "درد کا سفیر" کے عنوان سے ریکارڈ ہوئے۔

ایکسائز والوں کی مہربانی سے رم جھم والا سلسلہ کاروباری اعتبار سے زیادہ منافع بخش ثابت نہ ہو سکا۔ عطاء کا کہنا ہے کہ ایک دفعہ کراچی کے ایک بڑے ہوٹل میں اس کا ایک خصوصی شو منعقد ہوا۔ ٹکٹوں کی فروخت کے حساب سے ہزاروں روپوں کی آمدنی ہوئی۔ مگر ایکسائز ڈیوٹی، سازندوں کا معاوضہ اور ہوٹل کا بل ادا کر کے جب وہ ہوٹل سے نکلا تو جیب میں صرف کار کی چابی تھی۔

بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کی معرفت عطاء کی آواز دنیا کے ہر کونے میں پہنچ گئی۔ اور اسے قریب سے دیکھنے کا اشتیاق اس قدر بڑھ گیا کہ ڈنمارک اور ناروے جیسے دور دراز ممالک سے بلاوے آنے لگے۔ اس طرح عطاء کو متعدد ممالک میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے مواقع نصیب ہوئے۔

آج تقریباً گیارہ سال بعد بھی عطاء کی مقبولیت کا وہی عالم ہے جو پہلے تھا۔

عطاء نے لاہور میں مقیم ہونے کا فیصلہ کیا تو اس کے اکثر احباب کو یہ خدشہ لاحق ہو گیا کہ لاہور میں سکونت کہیں اس کے لئے نقصان دہ ثابت نہ ہو۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ لاہور میں سرکردہ فنکاروں کی جو اجارہ داری قائم ہے عطاء کے ہاتھوں اسے خطرے میں دیکھ کر اس کے خلاف محاذ آرائی برپا ہو سکتی ہے۔ مگر عطاء کی عالمگیر محبت اور انکسار نے ایسی صورت پیدا ہی نہیں ہونے دی۔ کہتے ہیں کہ شیخ زکریاؒ جب ملتان میں وارد ہوئے اور وہاں مستقل سکونت کا ارادہ ظاہر کیا تو اس زمانے کے برگزیدہ بزرگوں میں کسی نے دودھ سے لبالب بھرا پیالہ ان کی خدمت میں بھجوایا۔ شیخ زکریاؒ نے گلاب کا ایک پھول لبالب بھرے ہوئے پیالے میں ڈال کر پیالہ جوں کا توں واپس بھیج دیا۔ خادم جب وہ پیالہ لے کر ان بزرگ کی خدمت میں واپس پہنچا تو وہ دودھ کے اوپر گلاب کا پھول تیرتا دیکھ کر عش عش کر اُٹھے۔ فرمایا کیا خوبصورت جواب دیا ہے زکریاؒ نے۔

خادم کے دریافت کرنے پر انہوں نے فرمایا ''میں نے زکریاؒ کو دودھ سے لبالب بھرا ہوا پیالہ یہ سمجھانے کے لئے بھیجا تھا کہ ملتان کا شہر اولیاء سے لبالب بھرا ہوا ہے۔ لہٰذا یہاں کسی اور کے رہنے کی گنجائش نہیں ہے۔۔۔۔ زکریاؒ نے دودھ میں پھول ڈال کر یہ جواب دیا ہے کہ میں اس پھول کی طرح اپنے لئے گنجائش خود پیدا کرلوں گا اور اس طرح رہوں گا کہ میرے وجود سے کسی کو تکلیف بھی نہ پہنچے گی۔

کچھ اسی انداز میں عطاء بھی اہلِ فن سے لبالب بھرے ہوئے شہر لاہور میں مقیم ہے وہ سب سے پیار کرتا ہے اور سب اس سے پیار کرتے ہیں۔

آشیاں کتنے بنائے۔۔۔

عطاء کی شادیوں کے اعداد و شمار جمع کرنے کے شوقین حضرات مطلع ہوں کہ عطاء نے اب تک صرف چار شادیاں کی ہیں، اور کم از کم نوے سال کی عمر پانچویں شادی کرنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔۔۔۔ پہلی تین شادیوں کی ناکامی کے اسباب و وجوہات کی فکر میں دماغ سوزی کرنے والے احباب کی تسلی کے لئے میرا یہ شعر کافی ہوگا کہ

کوئی کہے تھی خطا تمہاری، کوئی کہے تھی میری خطا
اپنا گھر جلنے کا حاصل، صرف یہی افسانے ہیں

و راب یہ افسانے بھی ختم ہوجانے چاہئیں، کیونکہ ان سے طرفین کی دل آزاری کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

پہلی شادی

عطاء کی پہلی شادی اپنے خاندان میں ہوئی۔ اس شادی کی تقریب ہر لحاظ سے ایک یادگار تقریب تھی۔ اس لحاظ سے بھی کہ اس میں عطاء کے تمام احباب کو اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملا۔ کسی نے میزبانی کی اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا، تو کسی نے بجلی کی رنگا رنگ قمقموں سے آرائش کا کمال دکھایا۔ جس سے کچھ اور نہ ہو سکا اس نے ڈھول کی تھاپ پر رقص کر کے حق دوستی ادا کیا۔

سہرا بندی کی سعادت چچا جان کے حکم پر میرے حصے میں آئی۔ کاش اس وقت وہ پوری نظم میری دسترس میں ہوتی۔ عقیل عیسیٰ خیلوی کی خوبصورت کتابت میں یہ نظم ایک قد آدم فریم میں سجا کر میکدے کے ساتھ والے کمرے میں آویزاں کی گئی تھی۔ شائد اب بھی وہاں لگی ہو۔ بہر حال اب وہاں تک رسائی کے لئے بھی خاصا تردد درکار ہو گا، لہٰذا فی الحال ایک ہی شعر پر اکتفا کیجئے۔ یہ شعر میں نے عطاء کے ایک تازہ معاشقے کے حوالے سے لکھا تھا، جو اس بروقت شادی کے باعث پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ شعر تھا:

سمیٹتا ہے گریباں کی دھجیاں کوئی
نظر جو پڑتی ہے اس تار تار سہرے پر

روایتی انداز میں سہرا ساز و آواز سے مزین کر کے عطاء کی نذر کرنے کیلئے احباب کے اتفاق رائے سے نامور ریڈیو سنگر استاد امتیاز خالق عیسیٰ خیلوی کی خدمات حاصل کی گئیں دلہن کی طرح سجے ہوئے پنڈال میں رنگا رنگ روشنیوں سے آراستہ سٹیج پر بیٹھ کر استاد امتیاز خالق نے یہ سہرا اپنی خوبصورت آواز میں گایا تو محفل جھوم اٹھی۔ عطاء نے احباب کی معرفت فرمائشیں بھیج کر اوپر دیا ہوا شعر بار بار پڑھوایا۔

عطاء کے ایک من چلے دوست نے لاہور سے دو مغنیات بھی درآمد کر لی تھیں۔ اس محفل میں انہوں نے بھی اپنے فن کا جادو جگا کر بھرپور داد پائی۔

رات بھیگ چلی تو احباب نے پکڑ جکڑ کر عطاء کو بھی سٹیج پر لا بٹھایا۔ یہ الگ بات کہ اس رات کی نغمہ سرائی اسے خاصی مہنگی پڑی۔ وہ یوں کہ ایک مغنیہ اس کی آواز کے سحر میں گرفتار ہو گئی۔ یوں اس رات عطاء کی زندگی میں بیک وقت دو کہانیوں نے جنم لیا۔ ایک کہانی اس کی شادی کی، دوسری اس تازہ ترین معاشقے کی۔

عطاء کا دل اس زمانے میں بڑا بے حیا ہوا کرتا تھا۔ اتنا بے حیا کہ شادی کے چوتھے ہی دن عطاء اس مغنیہ کے تعاقب میں لاہور روانہ ہو گیا۔ شکر ہے وہ ہاتھ سے نکل گئی اور یہ حضرت

ایک دو دن گلیوں کی خاک چھاننے کے بعد بخیر و عافیت واپس آ گئے۔

شادی کے بعد دو تین سال کا عرصہ تو سکون سے بسر ہوا، مگر پھر خاندانی رنجشوں کی آندھیاں اُٹھیں اور اس آشیاں کا تنکا تک شاخ پہ باقی نہ رہا۔

دوسری شادی

عطاء کی دوسری شادی کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بس اتنا معلوم ہوا کہ عطاء بعض احباب کی دعوت پر کراچی گیا۔ وہاں سے واپس آیا تو ایک خاتون ہمراہ تھیں۔ چند ہی روز بعد یہ معلوم ہوا کہ وہ خاتون اپنے بعض عزیزوں کے ہمراہ کراچی واپس چلی گئیں۔ وجہ یہ تھی کہ کراچی کے ہوادار ماحول میں پرورش پانے والی لڑکی کو عیسیٰ خیل کا محبوس گھریلو ماحول راس نہ آ سکا۔

باہر کی خواتین کے لئے عیسیٰ خیل کے ماحول میں رہنا واقعی خاصا مشکل ہے۔ عیسیٰ خیل میں اپنے پانچ سال قیام کے دوران میں نے ایک آدھ مرتبہ سے زیادہ کسی خاتون کو گھر سے نکلتے نہیں دیکھا فلک بوس حویلیوں سے خواتین کے جنازے تو نکلتے دیکھے، کسی زندہ خاتون کو باہر نکلتے نہیں دیکھا۔

پردہ کے بارے میں عیسیٰ خیل کی روایات بہت سخت ہیں۔ شادی بیاہ کے موقع پر بھی آپ کو خواتین کے لمبے لمبے جلوس ڈولی کے ہمراہ نظر نہیں آئیں گے۔ بلکہ ڈولی بھی نظر نہیں آئے گی کیونکہ پردہ داری کی خاطر ڈولیاں ہمیشہ رات کے وقت اُٹھائی جاتی ہیں اور ڈولی اُٹھانے کے لئے کوئی بارات وارات نہیں جاتی۔ بس دولہا کے چند قریبی رشتہ دار جا کر ڈولی اُٹھا لاتے ہیں۔

تیسری شادی

۱۹۸۳ء میں عطاء انگلینڈ کے دورے سے واپس آیا تو اور چیزوں کے علاوہ ایک دلہن بھی ساتھ لایا۔ عام طور پر پاکستانی بھائی ولایت سے ولایتی دلہن لاتے ہیں۔ مگر عطاء کی یہ دلہن نا صرف پاکستانی تھی بلکہ اس کے اپنے ضلع میانوالی اور اس کے اپنے قبیلے نیازی کی ایک سادہ سی لڑکی تھی۔ یہ شادی بظاہر خاصی کامیاب شادی تھی۔ مگر کچھ عرصہ بعد یہ سنا کہ میاں بیوی میں علیحدگی ہوگئی۔ اور پھر کچھ عرصہ بعد سنا کہ یہ علیحدگی مستقل ہوگئی ہے۔ لوگ کچھ

بھی کہیں، پے در پے تین شادیوں کے حسرت ناک انجام نے عطاء کے جذبات اور اعصاب کو بری طرح مجروح کیا۔ گھر کا اجڑنا اتنا معمولی سانحہ ہرگز نہیں ہوتا کہ انسان اسے ہنسی خوشی برداشت کر کے بھلا دے اس قسم کے سانحہ کے بعد نارمل ہونے میں ایک عرصہ لگتا ہے۔

چوتھی شادی

عطاء کی چوتھی بیگم (بھابھی بازغہ) فن کے راستے اس کی زندگی میں داخل ہوئیں۔ لاکھوں لوگوں کی طرح یہ بھی عطاء کے فن پر فریفتہ ہوئیں۔ مگر ان کا عشق ذرا وکھری ٹائپ کا تھا۔ عطاء نے ایک دفعہ بتایا کہ اس کے ایک کمرشل فنکشن میں انہیں ہال میں جگہ نہ مل سکی تو سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے تقریب کے چار پانچ گھنٹے گذار دیئے۔ مگر تھک ہار کر لوٹ جانا گوارانہ کیا۔ عطاء سے تعارف غالباً اسی موقع پر تقریب کے بعد ہوا۔ اور عطاء ان کے خلوص سے اس قدر متاثر ہوا کہ بہت جلد یہ تعارف افہام و تفہیم کے مراحل سے گذر کر شادی کی صورت میں زندگی بھر کا ساتھ بن گیا۔

عطاء کی اس شادی کی کامیابی کی اصل وجہ یہ ہے کہ مشرقی روایات کے مطابق بازغہ نے عاشق کا رول اپنے لئے منتخب کیا اور محبوب کا درجہ عطاء کو دیا۔ اس کی ہر ادا سے پیار کر کے اس کی تمام تر محرومیوں کی تلافی کرنا اپنا فرض سمجھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت جلد اولاد کی نعمت سے بھی نواز دیا اور یوں عطاء اپنے ماضی کی تمام تر تلخیوں اور محرومیوں کو بھلا کر اپنی وفا شعار بیوی اور دو ننھے منے بچوں سانول اور لاریب کے ساتھ مسرت اور اطمینان کی زندگی بسر کر رہا ہے اور یار لوگ خوش ہیں کہ

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

اور عطاء کی بیگم اس بات پر خوش ہیں کہ۔۔۔

وہ جہاں بھی گیا لوٹا تو مرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی

وہ کیا چکر تھا؟

عطاء سے دوستی کا ایک فائدہ یا نقصان یہ ہے کہ ہمارا تعارف جہاں بھی ہو عطاء سے دوستی کا حوالہ اس عالم فانی میں ہمارے وجود کے جواز کے طور پر ضرور پیش کیا جاتا ہے۔

’’جی یہ منور علی ملک صاحب ہیں۔عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی کے بہت قریبی دوست ہیں۔عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی نے ان کے لکھے ہوئے بہت گیت گائے ہیں مثلاً وہ گیت ہے نا:۔

سچی دس وے ڈھولا کل کیوں نئیں آیا

اچھا؟ پھر تو یہ بڑے کام کے آدمی ہیں۔انہیں تو سب کچھ پتہ ہوگا۔کیوں ملک صاحب، وہ کیا چکر تھا؟‘‘

چکر سے مراد وہ عطاء کا وہ پہلا پیار ہے جس نے عیسیٰ خیل کے دور اُفتادہ قصبے کے نوجوان عطاء اللہ خان نیازی کو مشہور زمانہ گلوکار عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی بنا دیا۔

عطاء کے اس عشق کے بارے میں تجسس عرب اسرائیل جنگ، مسئلہ افغانستان اور تخفیف اسلحہ جیسے نازک مسائل کے بارے میں تشویش سے کسی طرح بھی کم نہیں۔

’’ہاں تو وہ چکر کیا تھا یار؟‘‘ یہی سوال لفظ بالفظ سنتے سنتے اب تو ہم عاجز آ گئے ہیں۔کاش ہم اس سوال کا صحیح جواب بتا سکتے، مگر۔۔۔۔۔۔۔

اس ناگزیر سوال کا جواب نہ دے سکنے کی بے بسی میں جھنجھلا کر ہم بعض اوقات تو سوال کرنے والے پر برس پڑتے ہیں۔

’’ہاں تو وہ کیا چکر تھا یار؟‘‘ ہمارے ایک پروفیسر دوست نے کہا۔

’’کون سا چکر؟‘‘ ہم نے چمک کر پوچھا۔

’’وہی یار عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی والا۔سنا ہے اس نے کوئی عشق وشق کیا تھا؟‘‘

’’کیا ہوگا۔ہمیں اس سے کیا؟‘‘

’’سنا ہے اسی عشق نے اس کو عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی بنا دیا۔‘‘

’’آپ نے کبھی عشق نہیں کیا؟‘‘

’’ہاں۔کیا تو تھا۔۔۔۔۔‘‘

’’تو پھر آپ عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی کیوں نہیں بن سکتے؟‘‘

یہ تسلی بخش جواب سن کر بھی وہ صاحب مطمئن تو نہیں ہوئے مگر ہمارا موڈ دیکھ کر خاموش ہی رہنا مناسب سمجھا۔

جن احباب سے ہمارا تعارف ہو چکا ہے انہیں تو ہم نے کوئی نہ کوئی الٹا سیدھا جواب یقیناً دے دیا ہوگا۔اب آئندہ جن خواتین وحضرات سے تعارف ہوگا ان کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ صاحب

آپ وہ بات کیوں پوچھتے ہیں

جو بتانے کے قابل نہیں

اور وہ بات بتانے کے قابل اس لئے نہیں کہ اس کے منظر عام پر آنے سے کسی کا ہنستا بستا گھر ایک لمحہ میں اُجڑ جائے گا۔ اس لئے اس راز کا انکشاف مجھے یا عطاء کو کسی قیمت پر بھی گوارا نہیں ہو گا۔

ایک انسان کئی افسانے

عطاء کے عشق کی داستان تو ایک فقرے میں سمٹ گئی۔ مگر اس کے معاشقوں کی تفصیل ایک کتاب تو کیا، کئی جلدوں میں بمشکل سمائے گی۔

مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ عطاء جہاں بھی گیا ایک آدھ فالتو دل جیب میں ڈال کر ہمراہ لے گیا۔ اور حسب ضرورت کسی نہ کسی کو دے کر ہی لوٹا۔ ہمارے علم کے مطابق اس کا ایک دل ملتان میں کسی کے پاس ہے۔ ایک گوجرانوالہ میں کسی کی سنگھار میز کی دراز میں رکھا ہے۔ ایک پنڈی میں کسی کے بیوٹی بکس میں محفوظ ہے۔ ایک اسلام آباد میں کسی کے پرس میں قید ہے۔ لاہور میں تو بے شمار گھروں میں ڈیکوریشن پیس کے طور پر مکراموں وغیرہ میں دیکھنے میں نظر آتا ہے۔ دیہات میں البتہ نہ سنگھار میزیں ہوتی ہیں، نہ بیوٹی بکس، نہ پرس، نہ مکرامے لہٰذا وہاں یہ پلو میں بندھا یا تکیے کے غلاف میں ملفوف ملے گا۔

عذرا خان

نام اس کا جو بھی ہو، لوگ اسے عذرا خان کے نام سے جانتے تھے۔ وہ سانولی سی خوش چہرہ لڑکی نہ جانے کہاں سے آئی تھی۔ کچھ عرصہ ہمارے گاؤں میں سبزی وغیرہ کا کاروبار کرتی رہی، ایک شادی بھی ہوئی۔ دو بچے بھی ہوئے۔ پھر خاوند نے طلاق دے دی۔ کچھ عرصہ داؤدخیل ہی میں رہی، پھر پتہ نہیں کس کے مشورے پر عیسیٰ خیل آ گئی اور بس سٹینڈ پر سبزی کی دکان بنالی۔ بڑی دلیر لڑکی تھی۔ کیا مجال کہ جو کوئی مرد آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ ذرا سی ایسی ویسی حرکت پر اچھے خاصے مردوں کی روئی کی طرح دھن کے رکھ دیتی تھی۔۔ سچ پوچھئے تو لوفر لفنگے قسم کے مرد اس کی دکان کے سامنے سے بھیڑوں کی طرح سر جھکا کے گذر جاتے تھے۔

عیسیٰ خیل میں عذرا کی آمد کا مجھے علم نہ تھا۔ ایک دن الصدف جنرل سٹور سے میں

اور عطاء سہ پہر کو سیر کے لئے نکلے۔ راستے میں عطاء کے ایک دوست کی فروٹ کی دکان تھی۔ علیک سلیک کے لئے وہاں رکے تو صاحب سیب وغیرہ کاٹنے کے تکلفات میں پڑ گئے اور ہمیں کچھ دیر وہاں رکنا پڑ گیا۔ ہم وہاں بیٹھے سیب کھا رہے تھے کہ اچانک برابر والی دکان سے عذرا نمودار ہوئی۔ ہمارے گاؤں میں طویل عرصہ تک قیام کی وجہ سے وہ ہمارے لیے اجنبی نہ تھی۔ پھر بھی اس سے مخاطب ہونے کی جرأت ہم سے نہ ہو سکی۔ مگر ہماری یہ بزدلی بھی ہمارے کام نہ آئی وہ سیدھی ہماری طرف آئی اور خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد عیسیٰ خیل میں اپنی آمد کے اسباب، واقعات اور نتائج کی تفصیل بیان کرنے لگی۔ عطاء اور اس کا دوست ہماری اس شناسائی پر حیران و پریشان آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے:

ہم تو مرشد تھے یہ ولی نکلے

ان کی حیرت، پریشانی اور سراسیمگی کو بھانپ کر عذرا نے انہی کی زبان (آنکھوں ہی آنکھوں میں) ہم سے پوچھا کہ یہ شرفاء کون لوگ ہیں؟

دوسرے دوست کا تعارف کرانے کے بعد عطاء کی طرف اشارہ کر کے کہا:

''اور یہ ہیں عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی''

''وہ جو گاتا ہے؟''

''جی ہاں۔''

''مذاق نہ کرو''۔

''سچ کہہ رہا ہوں۔ اس میں مذاق کی کون سی بات ہے؟''

''چلئے مان لیا۔ مگر یہ کیسا عطاء اللہ ہے؟ ہم تو سمجھتے تھے وہ کوئی بڑی عمر کا آدمی ہوگا۔''

''آدمی تو یہ بھی ہے، مگر اپنی عمر بڑھانا اس بیچارے کے اختیار میں نہیں۔''

اس بات پر عطاء سمیت سب نے قہقہہ لگایا۔۔۔ اور پھر وہ براہ راست عطاء سے مخاطب ہوئی۔۔۔ بس یہی تعارف بقول ساحر لدھیانوی روگ بن گیا۔ فراز صاحب کی طرح عطاء نے بھی جس کو چاہا ہے اتنی شدت سے چاہا ہے کہ اپنی ہڈی پسلی کا بھی خیال نہیں کیا۔

ایک نتیجہ اس نئی چاہت کا یہ نکلا کہ عطاء اکثر میکدے سے غائب رہنے لگا۔ ہم لوگ حسبِ معمول اپنے مقررہ وقت پر میکدے میں جمع ہوتے۔ عطاء کی غیر حاضری پر بحث کرتے اسے راہِ راست پر لانے کے منصوبے بناتے، مگر ان منصوبوں پر عمل درآمد کبھی نہ ہو سکا، کیونکہ بعض احباب ایسے بھی تھے جو عطاء کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کے سخت

مخالف تھے۔ لہٰذا ہر رات کی بحث آپس میں تو تکار اور تلخ کلامی پر ختم ہوتی۔

الصدف جنرل سٹور میں بھی عطاء شاذونادر ہی دیکھنے میں آتا۔ البتہ بس سٹینڈ پر سبزی اور فروٹ کی دکانوں کے گردونواح میں کہیں نہ کہیں۔۔۔ الحفیظ ہوٹل کی کسی میز پر یا لالا کریم خان کے ہوٹل کی کسی چارپائی پر۔۔۔۔ بیٹھا، ضرور مل جاتا، مگر جذب و مستی کی ایسی کیفیت میں ہوتا کہ اسے دیکھ کر بے اختیار، اس پر ترس آجاتا، اور ہم لوگ اس کے ساتھ چائے کی ایک آدھ پیالی پی کر نصیحتوں کی پٹاری بغل میں دابے چپ چاپ واپس آجاتے"

اور پھر ایک صبح اتفاقاً چچا جان نے اچانک میکدے کا دروازہ کھول کر دیکھا تو عطاء اور عذرا بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ چچا جان نے تڑاخ سے دروازہ بند کیا اور گھر چلے گئے۔ اگلی صبح پتہ چلا کہ عطاء گھر سے غائب ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس کے غائب ہونے کا عذرا کو بھی علم نہ ہوا۔ اور وہ بیچاری کئی دن تک ہر آتے جاتے سے اس کا پتہ پوچھتی اور کوئی واضح جواب نہ پا کر اس آس پر قناعت کر لیتی کہ اس کی محبت عطاء کو کہیں بھی چین سے نہ بیٹھنے دے گی۔ اور وہ ایک نہ ایک دن وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ضرور واپس آجائے گا۔

تقریباً ایک ماہ بعد کراچی سے ایک دوست خبر لائے کہ عطاء ان دنوں وہاں اپنے بعض احباب کے ہاں مقیم ہے ان صاحب سے عطاء کا پتہ لے کر ہم نے ایک لمبا چوڑا نصیحت آموز خط فی الفور عطاء کے نام روانہ کیا۔ توقع تھی کہ اس خط کے جواب میں

کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بندھے

مگر جواب میں چند روز بعد ایک مختصر سا خط ملا۔ جس میں نہایت عاجزی سے یہ التجا کی گئی تھی کہ لالا مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ اور میری واپسی کا خیال بھی دل سے نکال دو کہ

وحشی کو سکوں سے کیا مطلب جوگی کا نگر میں ٹھکانہ کیا

اور ہاں، عذرا کہاں ہے؟ اور کس حال میں ہے؟ اسے کہنا کہ۔۔۔۔

میری یاد میں تم نہ آنسو بہانا
نہ جی کو جلانا مجھے بھول جانا

عطاء کا یہ حوصلہ شکن جواب پڑھ کر بھی ہم مایوس نہ ہوئے اور اگلے ہی دن ایک اور طویل و عریض خط لکھ بھیجا اس خط میں ہم نے عطاء کے والدین کی حالت زار کچھ ایسے جذباتی انداز میں رقم کی کہ خط لکھتے ہوئے ہاتھ لرز رہے تھے اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

یہ خط ارسال کرنے کے چار دن بعد بازار سے گزر ہوا تو قدم بے اختیار الصدف جنرل سٹور کی جانب مڑ گئے۔

چچا جان کاؤنٹر کے سامنے سر جھکائے بیٹھے دھیمی آواز میں عطاء کا ایک کیسٹ سن رہے

تھے۔ہمیں دیکھتے ہی چونک کر پہلے تو اپنی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو آستین سے
صاف کئے پھر ٹیپ ریکارڈر بند کر کے بڑے اشتیاق سے پوچھا:
''کوئی خبر ملی اس کی؟''
''جی ہاں چچا جان''میں نے کہا''وہ کراچی میں ہے میں نے اسے بڑا سخت خط لکھا ہے۔
مجھے یقین ہے کہ یہ خط ملتے ہی وہ انشاء اللہ فی الفور واپس آ جائے گا۔''
''اللہ کرے۔'' چچا جان نے ایک سرد آہ بھر کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور ریکارڈ پلیئر
پھر آن کر دیا۔عطاء کی آواز کمرے میں گونج اٹھی:

قبر اچ جاہ رکھساں متاں ڈھولا وی آ نکلے

چچا جان کی آنکھیں پھر بھیگنے لگیں۔مگر اب کی بار انہوں نے آنسوؤں کو چھپانے کی
کوئی کوشش نہ کی کیونکہ ایسے ہی آنسو ہماری آنکھوں سے بھی رواں تھے۔
ہم دونوں ایک دوسرے کو تسلی دینے کے لئے کچھ کہنا چاہتے تھے، مگر الفاظ گرفت
میں نہیں آ رہے تھے۔ہم اسی ادھیڑ بن کے عالم میں مبتلا تھے کہ ماسٹر وزیر وارد ہوئے اور عطاء
کے بارے میں پوچھنے لگے اس اچانک مداخلت پر چچا جان یک لخت بھڑک اٹھے۔۔
''تمہیں اس کی فکر کیوں کھائے جا رہی ہے تم ہی لوگوں نے تو اسے اس نوبت تک
پہنچایا ہے۔(تم لوگوں سے مراد ماسٹر وزیر نہیں بلکہ میں اور عطاء کے احباب تھے)
''تم لوگ اس کے اتنے خیر خواہ تھے تو اسے جانے کیوں دیا تمہاری تو وہ ہر بات مانتا تھا۔
تم نے اسے روکا کیوں نہیں؟ مجھے بتاؤ کیوں نہیں روکا اسے؟''
ماسٹر وزیر تو سوالات کی اس یلغار کے آگے نہ ٹھہر سکے اور چلتے بنے مگر میں سر جھکائے
مؤدب کھڑا رہا۔ چچا جان ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے۔ہم لوگ واقعی قصوروار تھے۔اگر ہم ذرا
سی عقل اور احتیاط سے کام لیتے تو عطاء کو اور اس کے گھر والوں کو یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔
چچا جان کا غصہ کچھ سرد ہوا تو ہم نے جانے کی اجازت چاہی۔چچا جان نے بڑے پیار
سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا دیکھو بیٹا میری باتوں کا برا مت ماننا۔پتہ نہیں کیوں آج میرے
دل کی حالت کچھ عجیب سی ہو رہی ہے۔''
الصدف جنرل سٹور سے ہم سیدھے گھر واپس آئے۔ابھی گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ
دروازے پر دستک ہوئی دروازہ کھولا تو عطاء سامنے کھڑا تھا۔
''میں آ گیا ہوں لالا''اس نے ہم سے بغل گیر ہوتے ہوئے کہا۔
جواب میں کچھ کہے بغیر ہم حیرت سے اس کے سراپا کو دیکھ رہے تھے۔عجیب حالت بنا
رکھی تھی اس نے۔جانے کراچی میں کیا کرتا رہا۔سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔چہرے پہ بیمارسی

زردی، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، بال بکھرے ہوئے، ناخن بڑھے ہوئے، لباس میلا، جیکٹ، لباس سے بھی زیادہ میلا کچیلا۔ ایک بڑا سا تھیلا کندھے سے لٹکائے وہ کتنا عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر ایسے لگتا تھا جیسے ہفتہ بھر سے کھانا، پینا، سونا، کچھ بھی نصیب نہیں ہوا۔ بہر حال دل ہی دل میں ہم اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہے تھے کہ جس حال میں سہی واپس تو آ گیا۔

اپنی واپسی کا قصہ سناتے ہوئے اس نے کہا:

لالا جس وقت تمہارا خط ملا، ایک دوست کے ہاں محفل موسیقی برپا تھی۔ بہت سے دوست جمع تھے۔ میں گا رہا تھا کہ تمہارا خط ملا۔ میں نے لفافہ کھولا خط کو وہیں ہارمونیم پر رکھ کر پڑھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔

۔۔۔اچھا دوستو! خدا حافظ۔ میں نے کہا، پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔۔۔ وہ لوگ حیران کہ اچانک یہ کیا ہو گیا۔ مگر میں نے کسی کو بتایا نہیں۔ آنسوؤں کو روکنے کی ناکام کوشش کرتا ہوا وہاں سے تیر کی سی تیزی سے نکلا۔۔۔ اپنی قیام گاہ پر جا کر سامان سمیٹا۔ وہاں سے سیدھا سٹیشن پر پہنچا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ لالا کیا ظالم خط لکھا تھا تم نے!

عطاء کی بخیریت واپسی پر اس کے گھر میں عید کا سا سماں بندھ گیا۔ امی اور بہنوں نے دو تین دن تک اسے باہر کی ہوا نہ لگنے دی۔ کیا کیا خوشیاں منائی گئیں، صدقے اور نذرانے بانٹے گئے۔ منتوں کی دیگیں پکائی گئیں۔ غرض یوں لگتا تھا کہ عطاء آج ہی پیدا ہوا ہے۔ اہلِ خانہ کی مسرت کا اظہار دو تین دن میں مکمل ہوا تو عطاء نے میکدے میں قدم رکھا اور آتے ہی پہلا سوال عذرا کے بارے میں پوچھا۔ معلوم ہوا کہ وہ چند روز قبل عیسیٰ خیل سے کوچ کر کے کہیں اور جا بسی ہے۔ مزید تحقیق و تفتیش سے اتنا پتہ چل سکا کہ وہ اٹک کے علاقے میں کہیں مقیم ہے۔ اٹک کون سا دور تھا؟ عطاء وہاں بھی جا پہنچا، مگر اس کے ٹھکانے کا صحیح پتہ نہ چل سکا۔

عطاء کے بزرگوں نے اسے راہِ راست پر لانے کے لئے آخری حربے کے طور پر فی الفور اس کی شادی طے کر دی۔

عطاء کی پہلی شادی کا ذکر مناسب حد تک تفصیل سے پہلے کر چکا ہوں۔ اس میں اتنا اضافہ یہاں برمحل ہو گا کہ بعض اطلاعات کے مطابق جب استاد امتیاز خالق سٹیج پر بیٹھے عطاء کا سہرہ گا رہے تھے تو عذرا سامنے والی گلی میں ایک لمحہ کے لئے نظر آئی۔ اس نے دیوار کے اوپر سے ایک نظر جھانک کر عطاء کو دیکھا اور پھر غائب ہو گئی۔ اور یوں سہرے کا یہ شعر سو فی صد سچا ثابت ہوا۔

سمیٹتا ہے گریباں کی دھجیاں کوئی
نظر جو پڑتی ہے اس تار تار سہرے پر

...اور سفر جاری ہے

خالی صفحہ

محفلِ شب برہم شد

عیسیٰ خیل میں چند سیدھے سادھے نوجوانوں نے نہ جانے کس کے مشورے پر راتوں رات امیر کبیر بننے کے ارادے سے ایک کمرشل جشنِ موسیقی منعقد کیا۔ پبلسٹی کے لئے بڑے بڑے پوسٹر چھپوا کر ضلع بھر میں اہم مقامات پر لگوائے۔ ان پوسٹروں پر گلوکاروں کی ایک طویل فہرست جلی حروف میں درج تھی۔ سرفہرست نام عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی کا تھا۔ اس کے بعد منصور علی ملنگی، شفیع اختر وتہ خیلوی، ایوب نیازی اور دیگر گلوکاروں کے اسمائے گرامی کی ایک لمبی قطار تھی۔ شو کے ٹکٹ ہاتھوں ہاتھ بکے۔ اہتمام پر دل کھول کر خرچ کیا۔ سرگودھا کی ایک معروف ٹینٹ سروس سے فرنیچر اور دیگر سامان منگوایا گیا۔ روشنیوں کی بہار دیکھنے کے لائق تھی۔ سٹیج کی آرائش لاجواب، سٹیج کے قریب ایک چمکتے دمکتے شامیانے کے نیچے عالیشان صوفوں پر ضلعی انتظامیہ حکام اور معززینِ شہر تشریف فرما تھے۔ عوام الناس کا ہجوم حساب وشمار سے باہر تھا۔ مگر اس تمام تر طمطراق کے باوجود منتظمین کے ہاتھ کچھ نہ آیا، کیونکہ عین موقع پر ایکسائز والوں نے سب کچھ یہ کہہ کر ہتھیا لیا کہ اس تقریب کے لئے ان سے پیشگی اجازت نہیں لی گئی تھی۔ ادھر یہ آفت ٹوٹی ادھر تقریب شروع ہوتے ہی لاؤڈ سپیکر نے جواب دے دیا۔ ایوب نیازی نے ابھی گیت کا دوسرا بند بھی مکمل نہیں کیا تھا کہ آواز غائب۔ سامعین کا احتجاج تالیوں سے شروع ہو کر گالیوں کی حدود میں داخل ہوا تو لاؤڈ سپیکر کا دماغ بھی درست ہو گیا۔ ایوب نیازی

صاحب نے ان حالات میں فن کا مظاہرہ کرنے سے معذرت کر دی تو سٹیج سیکرٹری (ہم ہی تھے) نے منصور علی ملنگی صاحب کی منت سماجت کر کے انہیں سٹیج پہ لا بٹھایا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ انہوں نے سامعین کو خوب محفوظ کیا۔ ان کے بعد شفیع اختر وتہ خیلوی میدان میں اترے۔ ادھر انہوں نے گیت شروع کیا ادھر لاؤڈ سپیکر کا مزاج پھر سے بگڑ گیا۔ وہ سٹیج سے رخصت ہوئے، تو ہم نے ایک بار پھر منصور علی ملنگی صاحب کو سٹیج پر لانے کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ بہ صد مشکل وہ رضامند ہوئے تو لاؤڈ سپیکر بھی راہِ راست پہ آ گیا۔ مگر اب سامعین عطاء کو سٹیج پہ لانے کا تقاضا کر رہے تھے۔ اور عطاء نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ منصور علی ملنگی جب پہلی بار گا رہے تھے تو اس وقت عطاء سٹیج کے عقب میں کھڑا انہیں بے تحاشہ داد دے رہا تھا۔ اس کے بعد نہ جانے کس وقت کدھر غائب ہو گیا۔ منتظمین کے پسینے چھوٹنے لگے۔ بہتیرا ڈھونڈا مگر وہ گردونواح میں کہیں ہوتا تو ہاتھ لگتا۔ یہ انکشاف بہت دیر بعد ہوا کہ وہ اچانک کسی کام سے کمر مشانی سدھار گیا تھا۔ پندرہ بیس منٹ کے شریفانہ احتجاج پر عطاء سامنے نہ آیا تو سامعین جارحیت پر اتر آئے۔ سب سے پہلے کسی ستم ظریف نے اس شامیانے کی طناب کاٹی جس کے نیچے حکام اور معززین تشریف فرما تھے۔ شامیانہ لہراتا بل کھاتا ان کے سروں پہ آ گرا اور اس کے ساتھ ہی بجلی کی رو بھی داغِ مفارقت دے گئی۔ وسیع و عریض پنڈال تاریکی میں ڈوب گیا۔ عجیب نفسا نفسی کا عالم تھا۔ اس نفسا نفسی کے عالم میں جس کے ہاتھ جو کچھ لگا اٹھا کر چلتا بنا۔ بعد میں حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ بیشتر دریاں، ایک آدھ شامیانہ، درجن بھر بانس، اتنی ہی ٹیوب لائٹس اور دو ڈھائی درجن بلب غائب ہیں۔

اس سانحے سے گذر کر ہم عطاء کی تلاش میں اس کے گھر پہنچے تو وہ میکدے میں موجود تھا۔

"کیوں صاحب! یہ کہاں کی شرافت ہے؟" ہم نے جلے بھنے لہجے میں غرا کر کہا۔۔

"بات یہ ہے بھائی!" عطاء نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ "سٹیج کے قریب مجھے ایک دو حضرات ایسے نظر آئے جن سے خاندانی رنجشوں کی بناء پر میرا وہاں ٹھہرنا مناسب نہ تھا"۔۔۔۔۔۔ یہ معقول جواب سن کر ہمارا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور پھر ہم نے اس تقریب کے عبرت ناک انجام کی تفصیلات الف سے یے تک ایک ہی سانس میں سنا ڈالیں عطاء کو اس واقعہ پر سخت صدمہ ہوا اور وہ کئی دن تک مغموم رہا۔

جگن ناتھ آزاد کے ساتھ ایک شام

۱۹۸۰ء میں جگن ناتھ آزاد اپنی جنم بھومی (عیسیٰ خیل) کی یاترا کے لئے آئے تو ان کے اعزاز میں خان والی داد خان رئیس اعظم عیسیٰ خیل کی کوٹھی کے وسیع وعریض لان میں موسیقی کی ایک خصوصی محفل بھی منعقد ہوئی جس میں جگن ناتھ آزاد اور ان کے والد (شہرہ آفاق شاعر تلوک چند محرومؔ) کا کلام عطاء نے نہایت سلیقے سے پیش کیا۔ اپنے آبائی شہر میں اپنے آنجہانی والد کا کلام اپنے ہی شہر کے ایک گلوکار کی پرسوز آواز میں سن کر جگن ناتھ آزاد اپنی آنکھوں میں اُمڈتے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکے۔ اور یہ آنسو غم کے نہیں، غم اور خوشی کے ملے جلے آنسو تھے۔ غم اپنے ماضی سے بچھڑنے کا، غم ان غمگسار چہروں کی جدائی کا جو ان کی طویل غیر حاضری کے دوران اس دنیائے فانی سے رخصت ہو چکے تھے اور خوشی اس بات کی کہ چالیس سال کی جلاوطنی کے بعد قدرت نے ایک بار پھر اپنے وطن آ کر اپنے بچپن کے ساتھیوں میں مل بیٹھنے کا موقع عطا کیا تھا۔

جگن ناتھ آزاد نے عطاء کے فن کو بہت سراہا۔ خاص طور پر وہ لوک گیت جو وہ بچپن میں سنا کرتے تھے ایک طویل عرصہ کے بعد پھر سن کر ان پر ایک عجیب سا کیف طاری ہو گیا۔ وہی کیف جو بچپن میں محسوس کیا کرتے تھے۔ انہوں نے بڑے پیار سے عطا کو گلے لگایا اور اسے دورہ بھارت کرنے کی دعوت دی۔ عطاء نے اپنے کیسٹوں کا ایک مکمل سیٹ ان کی نذر کیا۔

کچھ عرصہ بعد جموں سے ایک خط میں جناب جگن ناتھ آزاد نے لکھا کہ بھارت میں رہنے والے میانوالی کے تارکین وطن عطاء کے کیسٹ بڑے شوق سے سنتے ہیں اور ان کیسٹوں کے باعث ان کے گھر میں ایک میلہ سا لگا رہتا ہے۔

اپنی مٹی سے محبت ایک نہایت پاکیزہ جذبہ ہے۔ جس کی قوت اور شدت کا احساس وطن سے دور دیارِ غیر میں جا کر ہوتا ہے۔ وطن سے ہزاروں میل دور اجنبی ماحول میں ایک ہم وطن سے اچانک ملاقات ایک غریب الوطن کے لئے دنیا کی سب سے بڑی نعمت کا درجہ رکھتی ہے۔ دیدہ و دل فرشِ راہ کر کے بھی انسان کو یہ احساس ستاتا رہتا ہے کہ

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

عطاء جب یورپ کے دورے سے واپس آیا تو ناروے میں اپنے قیام کو اس طویل سفر کا سب سے خوشگوار حصہ قرار دیا۔ وجہ یہ تھی کہ وہاں جو محبت اسے ہرچرن چاولہ کے ہاں ملی اس کے تصور اور توقعات سے کہیں زیادہ تھی۔ آپ کو یاد ہو گا ہرچرن چاولہ بھارت کے ایک نامور افسانہ نگار ہیں۔ ان کا آبائی وطن میانوالی ہے۔ ان دنوں ناروے کے

شہر اوسلو میں مقیم ہیں۔ عطاء نے بتایا کہ ناروے میں بھی ہرچرن چاولہ نے اپنے گھر میں ایک ننھا سا میانوالی آباد کر رکھا ہے، یہی زبان، یہی معاشرت، یہی لباس، یہی خلوص، یہ مہمان نوازی غرض سب کچھ وہی ہے جو وہ چالیس سال قبل یہاں سے لے گئے تھے۔ ہرچرن چاولہ نے عطاء کو اوسلو اور گردونواح کے تمام علمی، ادبی و ثقافتی حلقوں میں بڑے فخر سے متعارف کرایا۔ وہاں کے ایک اردو اخبار اور مقامی زبان کے متعدد اخبارات و رسائل میں عطاء کے انٹرویو شائع کرائے اور اس کے اعزاز میں جگہ جگہ تقریبات منعقد کرائیں۔

بعض اچانک ملاقاتیں معجزے سے کم نہیں ہوتی۔ انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ فلاں جگہ فلاں صاحب سرراہ چلتے چلتے مل جائیں گے۔ مگر ایسا اکثر ہوتا ہے، حیرت اور مسرت سے انسان پاگل ہوا جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ذات کارساز کا شکر کس طرح ادا کیا جائے جس نے یوں اچانک ناممکن کو ممکن بنادیا۔

عطاء اور ہرچرن چاولہ کی ایک ایسی ہی ملاقات ۱۶ فروری ۱۹۸۸ء کی ایک شام شہزاد ہوٹل میانوالی میں ہوئی۔ جب ہرچرن چاولہ کی اچانک میانوالی آمد پر میانوالی اکیڈمی کے احباب نے شہزاد ہوٹل میں ان کے ساتھ ایک شام منائی۔ ہم سب لوگ ہرچرن چاولہ کے ہمراہ شہزاد ہوٹل پہنچے تو معلوم ہوا کہ عطاء ابھی چند منٹ پہلے یہاں پہنچا ہے۔ تقریب کے بارے میں اسے کوئی علم نہ تھا۔ وہ تو بس عیسیٰ خیل سے لاہور جاتے ہوئے بعض دوستوں سے ملنے کے لئے گھڑی بھر کو وہاں رکا تھا۔ یہ اتفاق تو اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں آیا ہوگا کہ دنیا کے آخری سرے (ناروے) سے بھی ایک دوست اس سے ملنے وہاں پہنچ جائے گا۔ ہرچرن چاولہ اپنے سفرنامے میں اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۔ میں پورنیما، سلیم بھائی، منور علی ملک اور ایاغ صاحب کے ہمراہ تیز قدموں سے ہال کی طرف دوڑتا ہوں، مگر مجھے راستے ہی میں ایک کمرے میں کھینچ لیا جاتا ہے، چھ سات لوگ بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔ سب سے گلے ملتا ہوں۔ آخری شخص نہ گلے ملتا ہے نہ مصافحہ کے لئے ہاتھ ہی بڑھاتا ہے۔ وہ نخرے کر رہا ہے۔ میں اسے کھینچ کر گلے لگا لیتا ہوں۔ وہ شخص یہ دیکھنے کو رکا تھا کہ میں اسے پہچانتا بھی ہوں کہ نہیں۔ مگر میں نے اسے پہچان لیا، اس لئے اس قدر زور سے بھینچ کر گلے لگایا ہے کہ میری اپنی ہڈیاں چرمرا اٹھی ہیں۔ عمروں کا فرق ہے بھئی۔ عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی پاکستان کا نمبرون نوجوان سرائیکی گلوکار۔ اس نے سرائیکی کو نہ صرف پاک و ہند بلکہ بیرونی ممالک میں بھی متعارف کرایا اور شہرت دی ہے۔ اس کی آواز میں بلا کا درد اور جادو ہے۔ اس لئے اسے بجا طور پر درد کا سفیر کہا جاتا ہے۔ یہ درد اسے عشق مین ناکامی (؟) سے عطا ہوا ہے۔ سرائیکی کے لوک گیت اس کی زبان سے

پھولوں کی طرح جھڑتے ہیں۔ وہ غزلیں بھی کمال فن سے گاتا ہے۔ اگست ۱۹۸۳ء میں وہ ناروے پروگرام دینے آیا تھا تو ہم وطن ہونے کے ناطے غریب خانے پر تشریف لایا تھا۔ آج وہ اپنی ڈیڑھ سالہ بیمار بیٹی کو عیسیٰ خیل سے لاہور لے جارہے تھے۔ میانوالی میں کسی دوست کے ہاں رکے، اور میز پر شام کے اس جلسے کا کارڈ دیکھا تو مجھے ملنے کو رک گئے۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے سے میرا انتظار کر رہے تھے۔۔۔۔۔۔"

کالا شاہ بدلا ناں وس۔۔۔۔

ستمبر ۱۹۸۱ء میں پی اے ایف کالونی میانوالی میں ایک یادگار محفل موسیقی منعقد ہوئی۔ سرگودھا اور بھکر تک کے لوگ عطاء کو سننے کے لئے اس محفل میں شریک ہوئے۔ اس محفل کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں میکدے کے سب ساتھی موجود تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ عطاء نے بے حد دل لگا کر گایا۔۔۔۔۔ سامعین کا ریسپانس (Response) بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ خاص طور پر "بودی چھنگا ڑنگ ڑنگ" والے گیت پر ایک میجر صاحب کا باوردی رقص تو ہمیشہ یاد رہے گا۔

محفل رات کے پچھلے پہر تک جاری رہی۔ عطاء نے سامعین کی فرمائش پر متعدد نئے اور پرانے گیت پیش کئے۔ آخر میں اس نے یونس خان مرحوم کا گیت

کالا شاہ بدلا ناں وس توں ساڈے دیس

چھیڑا تو سر شام چھائے ہوئے بادل کو شرارت سوجھی اور فوراً چھم چھم برسنے لگا۔۔ اس گیت میں کوئی مجبور دوشیزہ آسمان پر چھائے بادل سے التجا کرتی ہے کہ اے بادل تجھے میری مجبوریوں کی قسم توفی الحال نہ برس، کہ ابھی میرا محبوب پردیس سے واپس نہیں آیا۔ بس اسے آجانے دے، پھر جتنا جی چاہے، برس لینا۔۔۔۔۔ بادل کی ستم ظریفی نے اس گیت کو ایک عجیب رنگ دے دیا، کہ ادھر عطاء سسک سسک کر منتیں کر رہا تھا۔

کالا شاہ بدلا ناں وس توں ساڈے دیس

جھوکاں تھیسن آبادول

۱۹۸۳ء میں عطاء برطانیہ کے دورے سے واپس آیا تو ایک دن اچانک میانوالی میں گلشن سینما کے قریب ملاقات ہوگئی۔ باتوں باتوں میں مجھے یاد آیا کہ میانوالی اکیڈمی کے

احباب (بھائی سلیم احسن، محمد فیروز شاہ وغیرہ) ایک عرصہ سے عطاء کے ساتھ ایک شام منانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ عطاء کو دعوت دی کو کہنے لگا" آئندہ جمعرات کی شام کو آؤں گا، مگر شرط یہ ہے کہ تم آج میرے ساتھ عیسیٰ خیل چلو۔ پرسوں مجھے واپس جانا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کم از کم ایک رات میکدہ پھر آباد ہو جائے۔ سب پرانے دوست اکھٹے ہوں گے۔"

اس دن چونکہ مجھے کوئی ضروری کام تھا، لہٰذا میں نے معذرت کرتے ہوئے اگلے دن عیسیٰ خیل جانے کا وعدہ کر لیا۔

اگلے دن میں ایک دوست (اقبال کوچوان) کو ہمراہ لے کر سرِ شام عیسیٰ خیل پہنچ گیا۔

میکدے میں شام کا کھانا کھایا۔۔۔ توقع تھی کہ اب یاران میکدہ حسب معمول ترتیب سے ایک ایک کر کے آئیں گے اور پھر موسیقی کی محفل رات گئے تک چلے گی۔ مگر ہوا یہ کہ عطاء کے چند بزرگ تشریف لائے اور ادھر ادھر کی باتوں میں ایسے الجھے کہ رات کا ایک بجنے لگا، مگر ان کی بحث ختم ہونے کے آثار حد نظر تک دکھائی نہ دیتے تھے۔ یاران میکدہ بیٹھے دانت پیس رہے تھے۔ ایک ایک کر کے چلتے بنے کہ

یہاں تو بات کرنے کو ترستی تھی زبان ان کی

ہاتھ اور زبان باندھ کر مؤدب بیٹھے رہنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ عطاء نے اور ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ طے کیا کہ یہاں سپیئر پارٹس بن کر بیٹھے رہنے سے تو بہتر ہے کہ بس سٹینڈ پر جا کر ایک ایک پیالی چائے کی پی لی جائے۔

عطاء نے گاڑی نکالی اور ہم بس سٹینڈ کی جانب روانہ ہوئے۔ عقیل عیسیٰ خیلوی اور ماسٹر وزیر ہم رکاب تھے، چائے پینے کے بعد بھی احتیاطاً ہم لوگ ڈیڑھ دو گھنٹے وہیں بیٹھے رہے کہ مبادہ بزرگ حضرات ابھی فارغ نہ ہوئے ہوں۔

تقریباً تین بجے ہم ڈرتے ڈرتے واپس آئے تو میدان خالی تھا۔ اطمینان کا سانس لینا اس لئے مناسب نہ سمجھا کہ جس محفل کے ارادے ہم نے باندھے تھے اس کا اب نہ وقت تھا، نہ محل۔۔۔۔ عطاء کی انگلینڈ والی دلہن اسی دن عطاء کے ہمراہ پہلی بار سسرال آئی تھیں۔ ہم نے سوچا کہ وہ بھی کیا کہیں گی کہ عطاء کیسے لفنگے دوستوں کے ہاتھ آ گیا ہے جو صبح سے پہلے اسے گھر کا منہ ہی نہیں دیکھنے دیتے۔ لہٰذا ہم نے بڑی فراخ دلی سے عطاء کو تو چھٹی دے دی۔ اور خود میکدے میں (پہلی بار چارپائیوں پر) سونے کی تیاریوں میں لگ گئے۔ مگر ابھی تیاریوں سے فارغ نہ ہوئے کہ عطاء تکیہ بغل میں دابے واپس آ گیا۔ ہماری قہر آلود نگاہیں بھانپ کر کہنے لگا۔

"یار اتنی مدت کے بعد ملے ہیں، مگر جی بھر کے باتیں بھی نہ کر سکے، سونے کو تو

ساری عمر پڑی ہے، آؤ آج رات باتیں کرتے کرتے صبح کر دیں، تجویز معقول تھی۔ نہ بھی ہوتی تو ہم کون سا نیند سے مرے جا رہے تھے۔ سو ہم فوراً اٹھ بیٹھے اور بیتے دنوں کی راکھ کو کریدتے کریدتے اس میں سے ایک نیا دن ڈھونڈ نکالا۔ اس نئے دن کا زیادہ تر حصہ وی سی آر پر انڈین فلمیں دیکھتے بسر کیا۔ مجھ پر ترس کھاتے ہوئے عطاء نے صرف سیدھی سادھی باپردہ قسم کی فلمیں (کرما، قلی) وغیرہ ہی دکھانے پر اکتفا کیا۔ ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی تھا۔

دوپہر کے بعد ہم عطاء سے آئندہ جمعرات کو میانوالی آنے کا وعدہ لے کر رخصت ہوئے۔

ڈسٹرکٹ کونسل ہال کا پروگرام

تاریخ یاد نہیں۔ جمعرات کی شام تھی۔ عطاء حسب وعدہ تقریباً سات بجے میرے ہاں پہنچ گیا۔ ساز اور ساؤنڈ سسٹم وغیرہ کے لوازمات ساتھ تھے۔ بھائی سلیم احسن، فیروز شاہ اور دوسرے احباب کی معیت میں ہم سب تقریباً نو بجے ڈسٹرکٹ کونسل ہال پہنچے۔ عوام الناس کے بے قابو ہجوم سے بچنے کے لئے ہم نے اس تقریب کو صیغہ راز میں رکھا۔ صرف پینتیس چالیس اہلِ ذوق کا اجتماع تھا۔ تقریب کے پہلے دور میں احباب نے عطاء کے فن اور شخصیت کے حوالے سے گفتگو کی۔ فیروز شاہ نے عطاء کو میانوالی کا شناختی کارڈ قرار دیا۔ منصور آفاق، ندیم حیدر بلوچ اور ڈاکٹر اجمل نیازی نے عطاء کے فن کے بارے میں گفتگو کی اور پروفیسر سلیم احسن نے اپنے مخصوص رنگ میں سرائیکی میں منظوم خراجِ تحسین عطاء کی نذر کیا۔

دس بجے کے قریب عطاء نے پیر فرید کے کلام سے محفلِ نغمہ کا آغاز کیا

نہ مار نیناں دے تیرے وے توں سانولا

اس کے بعد فرمائشوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ عطاء نے حسب عادت ہر فرمائش پوری کی۔ پھر اپنی پسند کے گیت سنائے۔ اول سے آخر تک اس نے بہت ڈوب کر گایا۔ اسے قریب سے جاننے والے لوگ جانتے ہیں کہ کسی تقریب کے دوران اس کا موڈ بن جائے تو وہ اس انداز سے مسلسل گاتا ہے کہ محفل ختم کرنے کو نہ اس کا جی چاہتا ہے، نہ سامعین کا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت اس محفل میں بن گئی۔ سازندوں کے پسینے چھوٹ رہے تھے، طبلہ نواز نے میرے کان میں کہا کہ "لالا، تین راتوں کا رت جگا ہوں، میرے ہاتھ شل ہو چکے ہیں۔

خدارا کسی طرح لالا کو رکنے پر آمادہ کرو'۔ میں نے عطاء کو اس صورت حال سے مطلع کیا۔

اس نے مسکرا کر طبلہ نواز کے پسینے میں شرابور چہرے پر ایک نظر ڈالی اور محفل کے ختم ہونے کا اعلان کر دیا۔ صبح کے تین بج رہے تھے۔ سامعین بادل ناخواستہ گھروں کو روانہ ہوئے اور ہم اپنے گھر کو لوٹے۔ عطاء اور اس کے ساتھیوں نے شام کا کھانا (صبح چار بجے) کھایا۔ کھانا کیا تھا، گھر میں شام سے پکا ہوا جو کچھ موجود تھا وہی گرم کر کے کھا لیا کیونکہ عطاء نے تکلفات سے سختی سے منع کر دیا تھا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی فاروق قریشی صاحب کے ہاں کندیاں جانے کا پروگرام بن گیا اور ہم سب کندیاں چلے گئے۔ رات کے آخری لمحات وہاں سونے کی کوشش کرنے میں تمام ہوئے اور علی الصبح ناشتہ کرنے کے بعد عطاء مجھے واپس میانوالی پہنچا کر لاہور چلا گیا۔

یہ ساری تفصیل عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ شہرت اور مقبولیت کے اس بلند و بالا مقام پر پہنچ کر بھی عطاء اپنے پرانے دوستوں کو بھولا نہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ ایک عالمی شہرت کا گلوکار محض ایک دوست کو خوش کرنے کے لئے لاہور سے میانوالی آیا۔ آمدو رفت کا خرچ اور سازندوں کا معاوضہ اپنے پلے سے ادا کیا اور مسلسل چار پانچ گھنٹے تک فن کا مظاہرہ کرنے کے بعد روکھی سوکھی روٹی کے چند لقمے کھا کر چلا گیا۔ صرف یہی نہیں، میانوالی کی اس محفل کے لئے اس نے اپنی تمام تر appointments بھی بالائے طاق رکھ دیں۔ اس دور میں ایسا خلوص اس قدر کمیاب ہے کہ تشنگان خلوص جاں بہ لب ہیں۔

عطاء کے پاس خلوص کی فراوانی اپنی جگہ، اس خلوص سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے کرم فرماؤں کی بھی کمی نہیں۔

بہت عرصہ ہوا میرے ایک واقف کار واہ فیکٹری سے عیسیٰ خیل میں وارد ہوئے۔ میں ان دنوں داؤدخیل میں مقیم تھا۔ وہ صاحب سیدھے عطاء کے ہاں پہنچے اور مجھ سے اپنے قریبی تعلق کا حوالہ دے کر عطاء کو واہ میں ایک شادی کی تقریب میں شمولیت کی دعوت دی۔ شادی ان کے کسی دوست کے کسی عزیز کی تھی۔ اس عزیز کے ایک بزرگ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ عطاء نے میری وجہ سے معاوضے کا تقاضہ نہ کیا، مگر ان صاحب نے از خود معاوضہ مقرر کر کے نصف رقم پیشگی دے دی۔ کاروباری اعتبار سے یہ معاوضہ عطاء کے لئے خاصا خسارے کا سودا تھا، مگر اس نے یہ سودا بخوشی قبول کر لیا اور یہ طے شدہ پروگرام کے مطابق واہ پہنچ گیا۔ دو تین گھنٹے حاضرین کو اپنے فن سے محظوظ کرنے کے بعد جب منتظمین سے واپسی کی اجازت چاہی تو انہوں نے کہا، کیسی واپسی صاحب! شادی تو کل ہوگی اور ہم نے دو دن کے

پروگرام کا معاوضہ طے کیا تھا۔"

عطاء کو طیش آ گیا، پیشگی لی ہوئی رقم جیب سے نکال کر ان کے منہ پر دے ماری اور فوراً گاڑی میں بیٹھ کر واپس آ گیا۔

ہم ان کے مہمان ہوئے۔۔۔۔

۱۹۸۰ء کے آخری دنوں میں عطاء نے اپنے چھوٹے بھائی ثناء اللہ خان (شنو بھرا) کو بھیج کر مجھے فیصل آباد بلوایا۔ وہاں پہنچ کر اس اچانک طلبی کی وجہ پوچھی تو جواب ملا "بس یونہی۔۔۔۔ ملنے کو جی چاہ رہا تھا۔ صبح تھوڑی سی ریکارڈنگ کرنی ہے اس کے بعد اسلام آباد چلیں گے۔"

رات رحمت گراموفون ہاؤس کی سب سے اوپر والی منزل پر ایک وسیع و عریض، آراستہ پیراستہ کمرے میں بسر کی۔ علی الصبح معروف گلوکار منصور علی ملنگی بھی وہاں آ پہنچے۔ وہ رات بھر فیصل آباد میں کسی شادی کی تقریب میں نغمہ سرائی کر کے آ رہے تھے۔ ان کے ہمراہ دو آدمی تھے، ایک نے ہارمونیم اٹھا رکھا تھا، دوسرے نے ایک گٹھڑی، دری پر بیٹھ کر انہوں نے گٹھڑی کھولی۔۔۔۔ نوٹ ہی نوٹ۔ ایک روپے سے لے کر سو روپے تک کے نوٹوں کا اچھا خاصا پلندہ۔ یہ تمام تر دولت ایک رات کی گلوکاری کا صلہ تھی وہ صاحب نوٹ گننے میں لگ گئے تو عطاء نے منصور علی ملنگی سے کہا "یہ ساری کمائی

کار چلاوے کوئی ہور

سے ہوئی نا۔"

اشارہ منصور ملنگی کے ایک انتہائی مقبول گیت کی طرف تھا جس کے بول

ماہی تاں میڈا بہوں ملوک اے
کار چلاوے کوئی ہور

پر انہیں بے تحاشہ داد ملتی تھی۔

منصور ملنگی نے اعتراف کیا کہ واقعی یہ تمام رقم اسی گیت پر داد کی صورت میں ملی تھی۔

پھر عطاء نے کہا: "لالا تمہیں سننے کے لئے تمہاری تقریب میں ضرور آتا، مگر میانوالی سے کچھ دوست آ گئے اور مجھے رکنا پڑا۔"

منصور نے جل کر جواب دیا "شکر ہے تم نہیں آئے میرے یہ چار پیسے بھی تم

سے نہیں دیکھے جاتے۔کم بخت! اگر تم وہاں نازل ہو جاتے تو مجھے کون سنتا۔''

یہ دلچسپ چھیڑ چھاڑ کچھ دیر چلتی رہی۔ پھر ہم سب نے ناشتہ کیا۔ منصور علی ملنگی جھنگ روانہ ہوئے اور ہم ریکارڈنگ انجینئر محمود بھائی کے ہمراہ ان کے سٹوڈیو کی طرف چل پڑے۔ ریکارڈنگ ہوئی، عطاء کا مشہور گیت

کپڑا ڈوریئے دا پتناں تے لوہڑ آئی آں

اس موقعہ پر ریکارڈ ہوا۔ تقریباً چار گھنٹے کی اس مسلسل ریکارڈنگ میں ہم بیٹھے بیٹھے تھک گئے، مگر عطاء متواتر چار گھنٹے گانے کی عرق ریزی کے باوجود ہشاش بشاش تھا۔ تاہم ہمارے لئے یہ کوئی حیرت کی بات نہ تھی۔۔ عطاء اس سے پہلے تقریباً بارہ گھنٹے کی لگاتار ریکارڈنگ کا ریکارڈ قائم کر چکا تھا۔

میرے چھوٹے بھائی شوکت علی ملک فیصل آباد کی فرٹیلائزر کمپنی میں ملازم ہیں۔ وہ بھی اس موقع پر ہمارے ساتھ تھے۔ ریکارڈنگ ختم ہوئی تو انہوں نے ہمیں اپنے ساتھ فیکٹری لے جانے کے لئے اصرار کیا۔ اصرار کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان کی فیکٹری کے مزدور ایک عرصہ سے عطاء کو ایک نظر دیکھنے کے خواہاں تھے۔

عطاء کی گاڑی میں ہم فیکٹری پہنچے۔ شوکت کے کوارٹر پر چائے وغیرہ پی۔ آنے جانے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ ہم تقریباً ایک گھنٹہ وہاں ٹھہرے، مگر لوگوں کا ہجوم ایک لمحہ کو بھی کم نہ ہوا۔ اس کے باوجود جب ہم روانہ ہوئے تو بے شمار مزدور جو کسی وجہ سے بروقت نہ پہنچ سکے، دور دور تک کھڑے ہاتھ ہلا ہلا کر عطاء سے اپنی محبت کا اظہار کرتے رہے۔ ایک حسرت بھری مسکراہٹ ان سب کے چہروں پر دیکھ کر بے اختیار میری پلکیں بھیگنے لگیں۔ ان کی معصوم مسکراہٹ یہ کہتی معلوم ہوتی تھی کہ ''لالا، ہماری بدنصیبی کہ تمہیں قریب سے دیکھنے کے لئے بروقت نہ پہنچ سکے۔ مگر یہی کیا کم ہے کہ دور سے سہی۔ تمہیں اپنے گھر میں دیکھ تو لیا۔ اب ہم بڑے فخر سے لوگوں کو یہ بتاسکیں گے کہ عطاءاللہ خان عیسیٰ خیلوی ہماری فیکٹری میں بھی آیا تھا۔''

میری نظر میں عطاء کی مقبولیت کا یہ مظاہرہ کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ عطاء کے یہ شیدائی وہ کم نصیب لوگ تھے۔ جنہیں دن رات کی محنت شاقہ کے صلے میں یہ معاشرہ صرف دو وقت کی روٹی دیتا ہے۔ وہ بھی اتنی کم کہ خود کھائیں تو بچے بھوکے رہ جائیں۔ اس لئے یہ لوگ بسا اوقات ناشتہ کئے بغیر علی الصبح گھر سے نکلتے ہیں اور فیکٹری کی کینٹین سے دس پیسے میں بدذائقہ چائے کی ایک پیالی پی کر کام میں لگ جاتے ہیں۔ اگر جیب میں پیسے ہوں تو چائے کی ایک اور پیالی پی کر دوپہر کے کھانے کی ضرورت پوری کر لیتے ہیں، ورنہ بھوکے ہی

شام تک مشقت میں مشغول رہتے ہیں۔۔۔ پیار، محبت اور احترام جیسی نایاب چیزیں ان کی دسترس سے ہمیشہ باہر رہتی ہیں۔

ان لوگوں کی عطاء سے اس قدر محبت! اللہ کی شان ہے۔ اس محبت کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔۔۔ شائد وہ عطاء سے اس لئے محبت کرتے ہوں کہ وہ ان کی محرومیوں اور مجبوریوں کا شکوہ ان الفاظ میں اللہ کے حضور میں پہنچاتا ہے۔

شکوہ اپنوں سے کیا جاتا ہے، غیروں سے نہیں

اور شکوہ وہ کرتا ہے جو اس کے وجود اور اس کے اختیارات پر یقین رکھتا ہو لہٰذا شکوہ اگر خلوص دل سے کیا جائے تو کارگر ثابت ہوسکتا ہے یہ باتیں شائد آپ کی سمجھ سے بالاتر ہوں، مگر ان لوگوں کی سمجھ سے بالاتر نہیں جن کا ذکر میں کر رہا ہوں۔۔۔

عطاء یوں تو ہر طبقے میں مقبول ہے۔ مگر اس کے زیادہ تر شیدائی مفلوک الحال، مظلوم اور مجبور لوگ ہی ہیں۔

سفر ہے شرط۔۔۔

فیکٹری سے ہم سیدھے براستہ گوجرانوالہ، اسلام آباد روانہ ہوئے۔ راستے میں گوجرانوالہ (غالباً سٹلائیٹ ٹاؤن میں) عطاء کے بعض عزیزوں کے ہاں کچھ دیر کیلئے رکے۔ دوپہر کا کھانا وہیں کھایا (وقت عصر کا تھا، مگر کھانا دوپہر کا) موسم بے حد خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ گاڑی میں لگے ہوئے ٹیپ ریکارڈ پلیئر پر کشور کمار کا مشہور گیت:

تیرے بنا بھی کیا جینا

غضب ڈھا رہا تھا۔ اور ہم بار بار ٹیپ کو Rewind کرکے یہ گیت سن رہے تھے۔ کھاریاں سے کچھ آگے نکلے تو اچانک گاڑی کے آگے لگا ہوا گرل (Grill) نکل گیا۔ شام کا سرمئی اندھیرا تیزی سے رات کی سیاہی میں جذب ہو رہا تھا۔ ہم گھبرا گئے کہ اب کیا ہوگا، آبادی سے کوسوں دور، رات کی تاریکی میں گاڑی کی اس اچانک ناسازیٔ طبع کی چارہ گری کون کرے گا؟

''کوئی بات نہیں'' عطاء نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''وہ سامنے میرے ایک دوست کا پولٹری فارم ہے وہاں ہمیں سب کچھ مل جائے گا۔''

ہم نے مڑ کر دیکھا تو واقعی چند قدم کے فاصلے پر، سڑک کے بائیں جانب ایک

پولٹری فارم تھا۔ پھر بھی ہمیں یہ فکر ضرور لاحق رہی کہ اس جنگل بیابان میں کار کی مرمت کا سامان کہاں سے آئے گا کیونکہ کار کی مشینری مرغی کی مشینری سے ذرا مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً ہمیں کار کے لئے چند چھوٹے سائز کے پیچ درکار تھے، جو ظاہر ہے مرغیوں کی ساخت میں کہیں بھی استعمال نہیں ہوتے۔

بہرحال عطاء کا اندازہ غلط نہ تھا۔ عطاء کے مرغبان دوست کی اپنی گاڑی وہاں موجود تھی اور اس کے فالتو پرزوں میں ہمارے کام کی سب چیزیں بڑی آسانی سے مل گئیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ چائے پانی سے ہماری تواضع بھی خوب ہوئی، اور ہم تروتازہ، ہشاش بشاش، ہنستے کھیلتے وہاں سے رخصت ہوئے۔

تیز رفتاری ہمیں ایک آنکھ نہیں بھاتی، مگر ڈرائیونگ ہم نہیں، عطاء کر رہا تھا۔ ہماری منت سماجت اور لعنت ملامت کے باوجود اس نے سوئی کو 140 کلومیٹر فی گھنٹہ سے نیچے نہ آنے دیا اور یوں ہم اپنے اندازے سے بہت پہلے اسلام آباد کے سیکٹر F/8-2 میں عطاء کے چھوٹے سے خوبصورت مکان میں جا اترے۔

اگلے دن اسلام آباد اور راولپنڈی میں مختلف دوستوں سے ملتے ملاتے رہے۔ دوپہر ڈھلنے لگی تو ہمارے تیسرے ساتھی نے دوپہر کے کھانے کی فرمائش کی۔ عطاء نے ہنس کر کہا "بھائی میں غریب آدمی ہوں۔ مانگ تانگ کر کھالیتا ہوں۔ اپنی جیب سے تو تمہیں کچھ کھلا نہیں سکتا۔ البتہ۔۔۔۔ چلو کسی کے در پر صدا لگاتے ہیں، کوئی اللہ کا بندہ کچھ نہ کچھ دے ہی دے گا۔

قریب ہی کیسٹوں کی ایک فیشن ایبل دوکان تھی۔ عطاء ہمیں ساتھ لے کر اس دوکان میں داخل ہوا تو دوکان کا مالک بسم اللہ، بسم اللہ کہتا اس سے لپٹ گیا۔

"فرمایئے کیا حکم ہے میرے لئے؟" اس نے علیک سلیک سے فارغ ہو کر کہا۔

"کھانا کھانا ہے۔" عطاء نے نہایت سادگی سے کہا۔

چند ہی منٹ بعد ہم مرغ مسلم، سیخ کباب اور نہ جانے کیا کیا کچھ نوش جان کر رہے تھے۔

باتوں باتوں میں عطاء نے دوکان کے مالک سے پوچھا: "میرے کیسٹ والیوم ۱۶ کے کتنے کارٹن (ڈبے) آپ کو ملے ہیں؟"

"کل دو سو کیسٹ آئے ہیں سرکار" اس نے جواب دیا "مگر میرا کام پہلے ہی بن گیا تھا۔ اس کیسٹ میں وہ گانا ہے نا "سچی دس وے ڈھولا۔ کل کیوں نئیں آیا"۔۔۔ اس کی اصل ریکارڈنگ میں ٹیلی ویژن سے لے آیا تھا۔ تقریباً ۷۰۰ کیسٹ پہلے ہی فروخت کر چکا

ہوں۔ دوسو یہ والے ایک دو دن میں نکل جائیں گے تو فیصل آباد سے اور منگوا لوں گا۔"

دن بھر کی سیر و تفریح (آوارہ گردی کہنا زیادہ مناسب ہوگا) کے بعد ہم واپس اسلام آباد پہنچے تو چند مہمان ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ایک صاحب میانوالی کے تھے۔ جو کاروبار کے سلسلے میں پنڈی میں مقیم تھے۔ ان کے ہمراہ دو مقامی حضرات تھے۔ محلّہ شاہ چن چراغ میں ان مقامی حضرات کے کسی عزیز کی شادی ہو رہی تھی۔ وہ شادی کی تقریب میں عطاء کو مدعو کرنے آئے تھے، میانوالی والے صاحب ان حضرات کے سفارشی تھے۔ اس لئے عطاء تقریب میں شمولیت سے انکار نہ کر سکا۔

اگلی شام ہم تقریب میں شمولیت کے لئے محلّہ شاہ چن چراغ پہنچے تو عوام الناس کا ایک جم غفیر جمع تھا۔ عطاء کے شیدائیوں کا جوش و خروش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ بڑی دھوم دھام سے ہمارا استقبال ہوا۔ نوٹوں والے ایک دو ہار ہمارے گلے میں بھی ڈالے گئے، کیونکہ اس تقریب میں عطاء کی شرکت کو یقینی بنانے کے لئے ہم نے بھی دعوت دینے والوں کی تائید میں چند کلمات کہے تھے۔

حاضرین کا ذوق و شوق دیکھ کر عطاء نے خوب گایا۔ محفل رات گئے تک جاری رہی۔ مرد حضرات کی زبانی اور عملی داد کے علاوہ بالائی منزل سے خواتین نے بھی نوٹوں کی موسلا دھار بارش شروع سے آخر تک جاری رکھی۔ دولت کو سمیٹنے اور سنبھال کر رکھنے کا کام عطاء کے طبلہ نواز بالے نے نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ یہ اوپر کی آمدنی معاوضے کی رقم سے کم نہ تھی۔

دو دن اسلام آباد میں قیام کے بعد واپسی کی اجازت چاہی تو عطاء بگڑ گیا۔

"اتنی جلدی واپس جانا تھا تو آئے ہی کیوں تھے"؟

"میری بات سمجھنے کی کوشش کرو لالا۔ ملازمت کا معاملہ ہے"۔

"گولی مارو ملازمت کو"۔

"ضرور مارتا۔ مگر ملازمت کو گولی نہیں لگ سکتی۔"

تھوڑی دیر کی بحث و تمحیص کے بعد ہم نے لڑ جھگڑ کر واپسی کی اجازت لے ہی لی۔

عطاء کے ہاں آمد و رفت سے ہم اس لئے گریز کرتے ہیں کہ واپسی کی اجازت کے لئے خاصا تشدد کرنا پڑتا ہے۔

۔۔۔کتاب لکھنا

دسمبر ۱۹۸۵ء میں ہم نے عطاء پر کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تو چند تجاویز اور مشورے لے

کر لاہور پہنچے۔ منصور آفاق، روشن ملک، عبدالمالک اور شکیب نیازی ہم رکاب تھے۔
عطاء نے ہماری تجاویز کو سراہا، مگر یہ شرط عائد کردی کہ کتاب لاہور ہی میں بیٹھ کر لکھی جائے۔
ہم نے آنکھیں بند کر کے یہ شرط منظور کر لی۔ ہمارا اندازہ تھا کہ کتاب لکھنا کون سا مشکل کام ہے، دو تین گھنٹے میں گھسیٹ کر رکھ دیں گے۔ اور پھر اطمینان کا سانس لے کر واپسی کی تیاریوں میں لگ جائیں گے۔

مگر ہوا یہ کہ پانچ دن کی مسلسل محنت شاقہ کے باوجود ہم کتاب کے صرف دو ہی باب لکھ سکے۔ اتنی محنت سے تو عطاء ہمارے ہاتھوں پرائمری سکول کی پانچویں جماعت تک پہنچا، ابھی اسے مزید پڑھانا، لکھانا، جوان کرنا اور۔۔۔ اور بہت کچھ کرنا باقی تھا۔۔۔ ہم عاجز آ گئے کہ پرائی اولاد کو پالنے پوسنے کا یہ کیا دھندا اپنے سر لے بیٹھے۔ صبح سویرے منصور آفاق اور دوسرے دوست تو اپنی پراسرار سرگرمیوں کے سلسلے میں باہر چلے جاتے۔ عطاء بھی ایک دو گھنٹے سے زیادہ ہمارا ساتھ نہ دے سکتا۔ اور ہم ڈرائنگ روم میں صوفے پر دراز، شام کا اندھیرا چھانے تک دھڑا دھڑ لکھتے رہتے، مگر اس کے باوجود پانچ دن میں صرف دو باب۔۔۔
ہم نے سوچا کہ اس حساب سے تو کتاب کی تکمیل میں کئی مہینے لگ جائیں گے۔
عطاء کو یہ صورت حال بتائی گئی تو کہنے لگا'' کیا فرق پڑتا ہے''؟ تمہارا اپنا گھر ہے۔ جب تک جی چاہے رہو۔ دو چار مہینے کی تو بات ہے۔ کام مکمل ہو جائے تو جدھر جی چاہے چلے جانا۔''

ہم نے عرض کیا'' لالا یہ درست ہے کہ آپ کا گھر میرا اپنا گھر ہے، مگر میرا ایک گھر ادھر میانوالی میں بھی ہے اور صرف گھر ہی نہیں، گھر والی بھی ہے اور بچے بھی ہیں۔ اس کے علاوہ میں سرکارِ عالی مدار کا ملازم بھی ہوں، لہٰذا اب اجازت چاہوں گا۔''

عطاء نے ایک نہ سنی اور اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس لئے ہم نے اپنی مدد آپ کے زریں اصول پر عمل کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اگلی صبح عطاء ابھی خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا کہ ہم نے میز پر پڑی ڈائری کا ایک ورق پھاڑا اور لکھنے لگے:
'' لالا ناراض نہ ہونا، ہم جا رہے ہیں، تمہیں اس حال میں چھوڑ کر جاتے ہوئے دل پر جو بیت رہی ہے وہ اپنی جگہ، مگر
جانے والے کو بہر حال چلے جانا ہے
یہ رقعہ میز کے عین درمیان میں رکھ کر ہم ساتھیوں سے مخاطب ہوئے:
دوستو! ہم جا رہے ہیں تمہارا اپنا گھر ہے جب تک جی چاہے یہاں رہو۔۔۔
عطاء ہمارے بارے میں پوچھے تو اسے یہ رقعہ دکھا دینا اور وہ یہ رقعہ پڑھ کر گرم ہونے لگے

تو اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنا۔۔۔اور ہاں اپنی صحت کا خیال رکھنا، وغیرہ وغیرہ۔"

یہ کہتے ہوئے ہم نے اپنا بریف کیس اٹھایا اور ساتھیوں کو حیران وششدر چھوڑ کر چل دیئے۔ ریلوے سٹیشن کے سامنے سے فلائنگ کوچ پکڑی اور صحیح سلامت گھر پہنچ گئے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ ان شریف آدمیوں نے ہماری ہدایات پر عمل بالکل نہیں کیا۔ بلکہ ہماری روانگی سے تھوڑی دیر بعد، عطاء کے بیدار ہونے سے پہلے وہ تینوں وہاں سے ترکِ سکونت کر کے کہیں اور منتقل ہوگئے اور وہاں سے فون پر عطاء سے رابطہ قائم کر کے اسے ہمارے فرار کی خبر دی۔۔۔جواب میں عطاء نے جو کچھ کہا وہ ان کمبختوں نے ہمیں آج تک نہیں بتایا۔ بہت عرصہ بعد میانوالی میں عطاء سے ملاقات ہوئی تو وہ بھی کچھ نہ بتا سکا۔ غصے کے عالم میں کہی ہوئی باتیں کب یاد رہتی ہیں؟

مندر میں محراب کی رونمائی

چشمہ لنک کینال وہ مخیرّ نہر ہے جو جاں بہ لب دریائے جہلم کو سندھ کا آبِ حیات فراہم کر کے اسے زندہ و رواں رکھنے کا کارِ خیر سرانجام دیتی ہے۔ ڈاکٹر اجمل نیازی کو میں ادب کی چشمہ لنک کینال کہا کرتا ہوں۔ رابطے کی یہ نہر میانوالی کی جوئے کم آب کو لاہور کے ساگر سے ملاتی ہے، اجمل نیازی جتنا میانوالی کا ہے اتنا ہی لاہور کا۔ اس کی یہ ذو وطنی میانوالی اور لاہور دونوں کے لئے فائدہ مند ہے کہ اس سے ان دونوں شہروں کے درمیان غلط فہمیاں اور بدگمانیاں رفع ہوتی رہتی ہیں۔

عمران خان کرکٹ کے آل راؤنڈر رہیں، مگر ان کی باؤلنگ ان کی شاندار بیٹنگ پر بہرحال بھاری ہے، اجمل نیازی ادب کا آل راؤنڈر ہے، مگر اس کی نثر اس کی خوبصورت شاعری پر بہرحال بھاری ہے، معاصر ادب میں اچھے نثر نگاروں کی کمی نہیں، مگر صاحبِ طرز نثر نگار صرف تین ہیں اور ان میں سے ایک اجمل نیازی ہے، بقیہ دو کے نام اس لئے نہیں بتاتا کہ بہت سے دوست ناراض ہو جائیں گے کہ ہمیں صاحب طرز کیوں نہیں سمجھا گیا۔ تاہم وہ سب اس بات پر مجھ سے سو فیصد متفق ہوں گے کہ اجمل نیازی کا خوبصورت اور انداز نگارش سب سے مختلف ہے۔ فیض کے شعر کی طرح اجمل کا فقرہ اپنی ایک الگ سب سے جدا پہچان رکھتا ہے۔

اجمل نیازی کے سفرنامہ بھارت مندر میں محراب کی ایک تعارفی تقریب میانوالی

میں بھی منعقد ہوئی۔ تقریب کا اہتمام میانوالی اکیڈمی نے کیا۔ صدارت پریشان خٹک نے کی اور مہمان خصوصی ڈاکٹر سلیم اختر، عطاء الحق قاسمی اور عطاء تھے۔ مندر میں محراب اور اجمل نیازی کی شخصیت کے بارے میں قائم نقوی، پروفیسر سلیم احسن، پروفیسر سرور نیازی، پروفیسر اشفاق چغتائی، شہزاد سلیم، عبید اللہ خاور نیازی، عصمت گل اور میں نے مضامین پڑھے۔ سٹیج سیکرٹری منصور آفاق تھے۔ اکادمی ادبیات کے خالد اقبال یاسر بھی شریک محفل تھے۔

سامعین کا اندازہ تھا کہ تقریب میں عطاء کی شمولیت محض کمپنی کی مشہوری کے لئے ہے اور تقریب کے آخر میں وہ ایک آدھ خوبصورت گیت پیش کر کے تقریب کو بہ خیر وخوبی پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا خوشگوار فریضہ سرانجام دے گا۔ مگر عطاء نے گیت کی بجائے مندر میں محراب پر مضمون پڑھا اور ایسا مضمون پڑھا کہ ڈاکٹر سلیم جیسا تنقید نگار بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ ''گلوکاروں کی روزی پر عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی نے لات ماری ہی تھی، مگر آج اس کا یہ مضمون سن کر یہ معلوم ہوتا ہے ہماری بھی خیر نہیں۔''

عطاء کو گلوکاروں کی حیثیت سے جاننے والے بہت کم لوگ یہ جانتے ہوں گے عطاء نہ صرف شعروں کے انتخاب کی حد تک بلند پایہ ادبی ذوق کا مالک ہے، بلکہ ایک بہت اچھا قلم کار بھی ہے۔ وہ دل میں اتر جانے والے گیتوں کے علاوہ نثر بھی بہت خوبصورت لکھتا ہے۔ اس سے خط وکتابت کرنے والے لوگ یقیناً اس کی تحریر کی خوبیوں کے معترف ہوں گے، اور صرف یہی نہیں، اس کی خوش نویسی بھی اپنی مثال آپ ہے۔

مظہر کی شادی

میرے بیٹے مظہر کی خانہ آبادی ۲۰ دسمبر ۱۹۸۸ء کو طے پائی۔ دلہن کی رخصتی جہلم سے ہونی تھی۔ میرے جہلم والے عزیزوں نے اصرار کیا کہ اس موقع پر عطاء جہلم میں نغمہ سرا ہو کیونکہ اس سے ایک تو اہل جہلم میں ہماری ناک اونچی ہو جائے گی اس کے علاوہ ان لوگوں کی ایک دیرینہ حسرت بھی پوری ہو جائے گی۔ ہماری نظر میں ناک اونچی ہونے سے زیادہ اہم بات جہلم کے عوام الناس کی حسرت کی تکمیل تھی۔ سو ہم نے عطاء کو شادی کی تقریب میں نغمہ سرائی کے لئے آمادہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

بعض مخلص دوستوں نے مشورہ دیا کہ عطاء کو مدعو کرنے کے لئے ہمیں خط یا ٹیلی فون پر انحصار کرنے کی بجائے بہ نفس نفیس لاہور جا کر عطاء کی منت سماجت کرنی چاہیئے۔

ایک صاحب کہنے لگے ''منور بھائی! تم فقیر لوگ ہر ایک کو اپنے جیسا سمجھ کر خوش فہمیوں میں مبتلا رہتے ہو مگر یہ معاملہ ذرا نازک سا ہے۔ عطاء بہت بڑا آدمی ہے اور بڑے آدمیوں کی مصروفیات اور مجبوریاں دوستی اور تعلقات جیسی غیر اہم چیزوں پر بآسانی غالب آجاتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عطاء ازراہ مروت شادی کی تقریب میں شمولیت کا وعدہ تو کرلے گا مگر یہ وعدہ ہرگز پورا نہیں کرے گا۔ عین وقت پر کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر تمہاری عزت خاک میں ملا دے گا اور تم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے لہٰذا ہماری بات مانو اور فی الفور لاہور جا کر بات پکی کرلو۔''

''آپ کا بے حد شکریہ، احباب''۔ ہم نے ان نصیحتوں اور ہدایات سے عاجز آ کر کہا۔ ممکن ہے آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں مگر میرا اور عطاء کا تعلق کچھ ایسا ہے کہ اس کے در پر سوالی بن کر حاضری دینے کی اجازت نہ تو میرا ضمیر دے گا اور نہ ہی عطاء کا ضمیر میری یہ تذلیل گوارا کرے گا۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ میرے بیٹے کی شادی میں عطاء کو بلانے کے لئے ۸۰ پیسے کا لفافہ ہی کافی ہوگا۔ چنانچہ میں نے اسی دن عطاء کو خط لکھ دیا۔ عطاء کا جواب فی الفور آیا۔ جواب مثبت ہی تھا۔ عطاء نے لکھا تھا کہ میں ساز و سامان سمیت لاہور سے براہ راست جہلم پہنچ جاؤں گا۔

داؤدخیل سے بارات کی روانگی سے ایک دو دن پہلے میں نے احباب کے اصرار پر عطاء کی آمد کنفرم کرنے کے لئے فون پر رابطہ قائم کیا تو عطاء نے ہنس کر جواب دیا ''آؤں گا تو میں ضرور، میری جان، مگر تم نے اب تک یہ نہیں بتایا کہ جہلم میں مجھے کہاں پہنچنا ہے، کوئی پتہ، کوئی نشانی، کوئی سراغ تو تم نے فراہم ہی نہیں کیا''۔

اس فروگذاشت پر معذرت کرتے ہوئے میں نے بتایا کہ سول لائنز جہلم کے علاقے گنبد والی مسجد کے عین سامنے والے گھر میں بارات اُترے گی۔ آپ تین بجے وہاں پہنچ جائیں اور مشتاق قریشی صاحب سے رابطہ قائم کریں۔

داؤدخیل سے جہلم تک تقریباً آٹھ گھنٹے کا سفر ہے۔ ایک بس، دو ویگنوں اور دو کاروں پر مشتمل قافلہ داؤدخیل سے آدھی رات کے بعد روانہ ہوا۔ اندازہ یہ تھا کہ ہم لوگ صبح آٹھ نو بجے تک جہلم پہنچ جائیں گے۔ مگر مسلسل بارش، بے پناہ سردی اور ناگفتہ بہ حد تک خراب سڑک نے سفر بہت طویل کر دیا ایک آدھ گھنٹہ تلہ گنگ میں میرے سسرال کے ہاں بھی رکنا پڑا اور یوں ہم صبح گیارہ بجے جہلم پہنچے، شب بیداری، شدید سردی اور سفر کی صعوبتوں کے باعث باراتیوں کی حالت زار قابلِ رحم تھی۔

نکاح ہوا، دوپہر کا کھانا ہوا اور جہیز کی نمائش کا سلسلہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا کہ

باراتیوں کے وفد ہماری خدمت میں حاضر ہونے لگے۔

''مر جائیں گے ہم لوگ، ملک صاحب۔ خدارا اب یہاں سے نکلنے کی فکر کیجئے۔

ایک رات کا رت جگا پہلے سے ہے۔ یہاں سے فی الفور روانہ نہ ہوئے تو ایک اور رات اکڑوں بیٹھ کر سفر میں بسر کرنا ہوگی۔۔۔۔''

ہم نے انہیں بہتیرا سمجھایا، مگران کی جانب سے منت سماجت کی گردان پھر بھی ختم ہونے میں نہ آئی، تو ہم نے خلافِ معمول اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے انہیں جانے کی اجازت دے دی۔

''آپ بھی چلیئے ناں ملک صاحب۔'' ایک صاحب نے کہا۔

''مجھے گولی مارو'' ہم پھٹ پڑے۔ ''تم لوگ اچھی طرح جانتے ہو کہ محض میری خاطر ایک شریف آدمی اس موسم میں دھکے کھاتا تین بجے لاہور سے یہاں پہنچے گا اور صرف سفر کی زحمت ہی گوارا نہیں کرے گا بلکہ اپنے پلے سے تین چار ہزار روپے خرچ کر کے یہاں پہنچے گا۔ ایک سالم ویگن کرائے پر لے گا۔ ساؤنڈ سسٹم کے لوازمات کا کرایہ اور سازندوں کا معاوضہ بھی اپنی جیب سے خرچ کرے گا۔ یہاں وہ محض حق دوستی ادا کرنے کے لئے نہ صرف بلا معاوضہ اپنے فن کا مظاہرہ کرے گا، بلکہ تمام متعلقہ اخراجات بھی اپنی جیب سے ادا کرے گا۔ لہٰذا اس کے یہاں پہنچنے سے پہلے میں تو واپسی کا تصور کرنا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔''

ہماری اس تقریر کا اثر تو خاطر خواہ ہوا، مگر بارات میں بیشتر حضرات ایسے تھے جنہیں اگلی صبح چھ بجے سکندر آباد فیکٹری میں اپنے کام پر حاضر ہونا تھا۔ لہٰذا ہم نے داؤد خیل سے آئے ہوئے سب لوگوں کو اجازت دے دی۔ میانوالی سے آئے ہوئے احباب، پروفیسر سلیم احسن، محمد مصور آفاق، مہر زمان خان، حیات اللہ خان، عبداللہ شاہ، ایوب نیازی، لیاقت علی خان، لالا شیر محمد، استاد امیر حسین وغیرہ ہمارے ہمراہ باقی رہ گئے۔ تین بجے تک عطاء کا انتظار کرنے کے بعد ہم نے جہلم کے پل پر اس کے استقبال کا پروگرام بنایا۔ پل پر گشت کرتے کرتے چار بج گئے۔ تو ہم نے احباب سے کہا کہ ممکن ہے کسی اچانک مجبوری کے تحت عطاء نہ پہنچ سکے، اس لئے آپ لوگ اگلی رات کے رت جگے سے بچنے کے لئے ابھی واپس چلے جائیں۔ مجھے تو بہرحال دولہا دولہن کے ہمراہ ہی آنا ہوگا۔ آپ لوگ چلیں، میں گھر جا کر بچوں کو ہمراہ لیتا ہوں۔ اب انشاء اللہ چکوال کے گرد نواح میں ملاقات ہوگی۔

ساڑھے چار بجے کے قریب ہم گھر پہنچے تو بڑی بوڑھیوں نے آڑے ہاتھوں لیا:

''تم کہاں غائب رہے اتنی دیر۔۔۔۔؟ دیکھتے نہیں ہو شام ہونے والی ہے۔ اور تم یہ بھی

جانتے ہو کہ سورج غروب ہونے کے بعد دلہن کی رخصتی سخت بدشگونی ہے۔''

یہ بدشگونی والی بات نہ ہم جانتے تھے، نہ مانتے تھے، مگر بھابھیوں، چچیوں اور خالاؤں کے ساتھ بحث میں الجھنے کی جسارت سلطان راہی جیسا لٹھ باز بھی کبھی نہ کر سکا ہوگا، ہماری کیا مجال تھی۔ فوراً کوچ کا حکم جاری ہوا، زرتار سہروں سے لدی کار دروازے پر آ کر رکی اور عین اسی وقت کسی نے آ کر بتایا کہ عطاء اور ڈاکٹر اجمل نیازی ایک بڑی سی گاڑی میں دروازے پر موجود ہیں۔ باہر آ کر دیکھا۔ اطلاع سو فیصد درست تھی۔ کیچڑ سے لت پت ویگن کی اگلی سیٹ پر عطاء اور ڈاکٹر اجمل نیازی بیٹھے تھے، پچھلی نشستوں پر پانچ سات آدمیوں کے علاوہ ان کا رخت سفر لدا ہوا تھا۔

''میں آ گیا ہوں لالا۔'' عطاء نے کہا۔

آپ کو یاد ہوگا بالکل یہی الفاظ اس نے پہلے بھی ایک نازک موقع پر کہے تھے۔

اس نازک موقع کی تلاش میں پیچھے لوٹنے سے پہلے بقیہ بات سن لیجئے۔ عطاء کہنے لگا:

''میں بہت نادم ہوں لالا سازندوں کی تلاش میں بہت وقت ضائع ہوا۔ بڑی مشکل سے یہ لوگ ہاتھ لگے ہیں۔ اجمل بھائی سے پوچھ لو ہم کتنے خوار ہوئے۔ مگر سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ کہاں بیٹھنا ہے۔''

''بیٹھنا کہاں ہے لالا؟ اب تو جانا ہے۔ ہم نے کہا اور انہیں باراتیوں کی ستم ظریفی اور بزرگ خواتین کی توہم پرستی کی تفصیلات بتا کر اپنی اس زیادتی کو جائز ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے اور یہ بتانا ہی بھول گئے کہ کس طرح عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی کے انتظار میں اردگرد کی سڑکوں اور گلیوں میں ہزاروں مقامی لوگ شدید سردی کے باوجود چار بجے تک کھڑے رہے۔ صرف عوام الناس ہی نہیں بلکہ سول اور ملٹری حکام بھی عطاء کے لئے سجائے گئے سٹیج کے سامنے کتنی دیر تک منتظر بیٹھے رہے۔ اور تھک تھکا کر بادل ناخواستہ رخصت ہو گئے۔

''دیر تو جو ہونی تھی ہو گئی'' عطاء نے متاسف لہجے میں کہا ''اب اس نقصان کی تلافی کیوں کر ہو سکے گی؟''

''چچا جان! آپ جمعہ کے دن ولیمے پر داؤدخیل آ جائیں تو تلافی ہو جائے گی۔'' مکھڑے پہ سہرا سجائے مظہر نے تجویز پیش کی۔

ضرور آؤں گا بیٹے'' عطاء نے مسکرا کر کہا'' مگر گا نہیں سکوں گا، کیونکہ تمہاری آنٹی بیمار ہیں اس لئے مجھے فوراً واپس لاہور جانا ہوگا۔''

اور پھر اپنی تمام تر مصروفیات اور مجبوریوں کے باوجود عطاء نے یہ وعدہ پورا کیا۔ میرے

دوستوں نے سچ ہی کہا تھا کہ عطاء بہت بڑا آدمی ہے۔

سانول سنگت کی تقریب

ستمبر ۱۹۸۹ء میں ادارۂ صدائے میانوالی نے عطاء کو صدائے میانوالی ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا تو سانول سنگت نے اس موقع پر ایک خصوصی محفلِ مشاعرہ اور عطاء کے ساتھ ایک شام کا اہتمام بھی کیا۔

یہ تقریبات ۱۰ ستمبر کو منعقد ہوئیں۔ محفلِ مشاعرہ کی صدارت رانا محمد افضل ڈپٹی کمشنر میانوالی نے کی، مہمانِ خصوصی پروفیسر پریشان خٹک، امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی تھے۔

اس محفل مشاعرہ میں مقامی شعراء کے علاوہ لاہور سے عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، حسن رضوی اور قائم نقوی نے شرکت کی۔ ڈیلوالا ضلع بھکر سے سونا خان بے وس اور قائدآباد ضلع خوشاب سے ملک آڈھا خان نطقال، بھکر سے تنویر صہبائی اور عیسیٰ خیل سے عتیل عیسیٰ خیلوی بھی تشریف لائے، بہاولپور سے پروفیسر ممتاز ملک کی شمولیت اس محفل کا ایک اور امتیاز بنی۔

پروفیسر پریشان خٹک نے محفل کے اختتام پر سامعین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ بعض اوقات حالات کی تلخیاں انسان کو شاعر بنا دیتی ہیں مثلاً میں نثر کی کئی کتابوں کا مصنف ہوں، مگر پریشان تخلص رکھنے کے باوجود اردو میں شعر کہنے کی سعادت نصیب نہ ہو سکی۔ تاہم حال ہی میں کچھ ایسی صورت بنی کہ فی البدیہہ ایک شعر زبان پر آ گیا۔ شعر یہ تھا:

آپ اچھے، رقیب بھی اچھے
ہم برے ہیں، ہماری قسمت ہے

اس محفل مشاعرہ کی میزبانی ڈاکٹر اجمل نیازی نے کی اور ہر شاعر کا تعارف اتنے خوبصورت الفاظ میں کرایا کہ سامعین کسی پر انگلی اٹھانے کی جسارت بھی نہ کر سکے۔

محفل مشاعرہ کے بعد محفل خورد و نوش منعقد ہوئی۔ اس محفل کی میزبانی عطاء کے مخلص دوست امیر عبداللہ خان سمند خیل نے کی۔ اجمل نیازی کی طرح انہوں نے بھی حق میزبانی اس خوش اسلوبی سے ادا کیا کہ آکلین وشاربین دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوئے (گھبرائیے نہیں، آکلین وشاربین عربی کے الفاظ ہیں جن کے معنی ہیں کھانے پینے والے) کھانے پینے سے فارغ ہوئے تو دفتر میونسپلٹی کے خوبصورت لان میں عطاء کے

ساتھ شام کی محفل برپا ہوئی۔

عطاء کے ساتھ شام کی محفل کا دلکش انتظام وانصرام محمد منصور آفاق افضل عاجز اور امیر عبداللہ خان اور ان کے مخلص احباب کے حسن تدبیر کا ثمر تھا۔ ٹیلی ویژن کی اصطلاح میں اس محفل کی میزبانی پروفیسر ممتاز ملک نے کی اور حق میزبانی اس خوبی سے ادا کیا کہ ٹیلی ویژن کے بیشتر میزبان کچھ عرصہ ان کے مہمان بن کر ان سے آداب میزبانی کی تربیت حاصل کر لیں تو ناظرین عمر بھر انہیں دعائیں دیتے رہیں۔

اس محفل میں پاک فضائیہ کے میانوالی بیس کے کمانڈر، پروفیسر پریشان، خٹک عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، حسن رضوی، قائم نقوی اور ضلعی انتظامیہ کے حکام سے لے کر رکشہ، ریڑھی والے محنت کشوں تک نے نہایت ذوق وشوق سے شرکت کی۔ محفل کے منتظمین نے جگہ کی قلت کے باعث محدود تعداد میں دعوت نامے جاری کیے تھے، مگر عطاء کی آمد کی خبر خوشبو کی طرح چار سو پھیل چکی تھی۔ اس محبت کی کشش نے ہزاروں افراد کو بن بلائے ہی حاضری دینے پر مجبور کر دیا۔ عطاء نے اپنے چاہنے والوں کا ہجوم دیکھا تو منتظمین سے کہا کہ ''تمہارے سب مہمان آ چکے، اب میرے مہمانوں کی خیر مقدم کے لئے دروازے کھول دو۔ یہ سب لوگ میرے مہمان ہیں۔ ان کے لئے جگہ کی فراہمی کی فکر نہ کرو، اور کہیں جگہ ملے نہ ملے، میرے دل میں ان سب کے لئے جگہ کافی ہے۔'' عطاء کی ہدایت پر عمل ہوا اور واقعی، جگہ کی تنگی کا سوال ہی پیدا نہ ہوا۔ اردگرد کے درختوں کی شاخوں پر بھی عطاء کے شیدائی پھول بن کر جھولتے نظر آئے۔

تقریب کا آغاز عطاء کے فن اور شخصیت کے حوالے سے گفتگو سے ہوا۔ عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، حسن رضوی اور ڈاکٹر اجمل نیازی نے اس موضوع پر بہت خوبصورت باتیں کہیں۔ میں نے اسی کتاب میں سے دو واقعات ''آج کچھ درد میرے دل میں'' اور ''رُٹھی نہ منیساں'' پڑھ کر سنائے۔

عطاء کو سٹیج پر دیکھنے کے لئے لوگوں کا اشتیاق ابھی سرگوشیوں کے مرحلے میں تھا کہ عطاء سٹیج پر آ گیا۔ فی الفور مجمع پر خاموشی چھا گئی۔ عطاء نے چند محبت بھرے کلمات سے حاضرین کی محبت کو خراج تحسین پیش کرنے کے بعد چند نعتیہ اشعار سے نغمہ سرائی کا آغاز کیا۔ اس کے بعد فرمائشوں کا وہ تانتا بندھا کہ سٹیج پر ہر طرف کاغذ کے پرزے رقص کرتے دکھائی دینے لگے۔ عطاء نے سب کی فرمائشیں پوری کیں۔ صرف ایک فرمائش توجہ کے لائق نہ سمجھی گئی۔ اور وہ فرمائش ہماری تھی۔ اپنے گیت

نت دل کوں آہدا ہاں

کل ماہی آسی

کے لئے، عطاء نے یہ فرمائش شاید اس لئے پوری نہ کی کہ اس کے سب کے سب ماہی اس کی آنکھوں کے سامنے موجود تھے۔ وہ جو صوفوں پر بیٹھے تھے، وہ بھی، اور وہ جو درختوں کی شاخوں پر جھول رہے تھے، وہ بھی، عطاء کا ماہی کوئی ایک نہیں۔ اس سے محبت کرنے والا ہر فرد اس کا ماہی ہے۔

بعض وجد آور گیتوں پر بھی خوب رقص ہوا۔ خاص طور پر ننھے منے اجمل خان کا رقص دیکھنے کے لائق تھا۔ جواں مرگ شاعر نیر سوچ کا الہامی گیت۔

یارو مینوں رونا ناں

سن کر واقف حال آنسو ضبط نہ کر سکے، عطاء نے یہ گیت قدر ڈوب کر گایا کہ گیت کے بول سرحد حیات کے اس پار سے نیر سوچ مرحوم کی اپنی زبان سے ادا ہوتے سنائی دیتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے مرحوم شاعر کی روح اس کے نحیف و نزار تن سے بچھڑنے پر بین کر رہی ہے۔

رات کے پچھلے پہر محفل ختم ہوئی، تو ہم مراسم رخصت کے تکلف سے دامن بچاتے، ہجوم میں تحلیل ہو کر وہاں سے نکل آئے۔ رانا ہوٹل سے چائے کی ایک گرما گرم پیالی نوش جان کی اور تیر کی طرح سیدھے گھر آ گئے، اہمیت نہ ہونے کے ہزار فائدوں میں سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آپ جب چاہیں، جہاں سے چاہیں غائب ہو جائیں، کسی کو یہ فکر لاحق نہیں ہوتی کہ فلاں شخص کہاں رہ گیا۔

اب اور حادثے کیا پیش آئیں گے اے دل!

۱۹ ستمبر ۱۹۸۹ء کو اچانک وہ ہولناک حادثہ رونما ہوا، جس نے عطاء کے لاکھوں چاہنے والوں کو کئی دن تک امید و بیم کی صبر آزما کشمکش میں مبتلا رکھا۔ حادثے کے بعد پہلے دو تین دن تک ایسی ایسی تشویشناک افواہیں گردش میں رہیں کہ اہل دل کے لئے ہر لمحہ قیامت بن کر گذرتا رہا۔ حسب معمول افواہوں کے اصل مآخذ کا پتہ آج تک نہ چل سکا۔ ایک سے ایک بری خبر، جو بھی سنا تا کسی نام کا حوالہ دیئے بغیر بس یہی کہتا سنا گیا ''میں نے سنا ہے کہ۔۔۔''

جس طرف جاتے جہاں سے گذرتے کوئی نہ کوئی لرزہ خیز اطلاع ہی کان میں پڑتی۔

''بیچارے کی سات پسلیاں ٹوٹی ہیں۔''

''میں نے سنا کہ ریڑھ کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی۔''

''سر میں بھی بہت گہرا زخم لگا ہے۔''

جتنے منہ اتنی باتیں، مگر کسی کو ان باتوں سے محظوظ ہوتے نہ دیکھا، بلکہ ہر لفظ بولنے والے کی زبان سے آنسو بن کر ٹپکتا اور زہر کا قطرہ بن کر سننے والوں کے کانوں سے دل کی گہرائیوں تک اتر جاتا۔ کیا کیا دردناک مناظر دیکھنے میں آئے۔ جذباتی قسم کے لوگ تو شدت غم سے مجبور ہو کر زار و قطار رونا شروع کر دیتے، ذرا سخت دل والے اپنی شہرت برقرار رکھنے کے لئے، منہ پھیر کر آہوں اور آنسوؤں کو چھپانے کے تکلفات میں پڑ جاتے۔ کچھ لوگ ادھر ادھر ہو کر تنہائی میں آنسو بہا لیتے۔ کچھ گھروں اور مسجدوں میں خدا کے حضور میں سر بہ سجود ہو کر عطاء کے لئے زندگی کی بھیک مانگنے میں لگ جاتے، عطاء کی ہزاروں ماؤں اور بہنوں نے منتیں مانیں، تسبیحات پڑھیں، صدقے اور خیراتیں بانٹیں اور پیروں فقیروں کے مزاروں کے دروازوں اور دہلیزوں سے لپٹ لپٹ کر اپنے بیٹے اور اپنے بھائی کی صحت کے لئے سفارشیں کروائیں۔

ہر گھر، ہر گلی، ہر محلے میں عطاء کی آواز گونجنے لگی۔ ٹیپ ریکارڈ پلیئرز کے گرد بیٹھے لوگوں کے دلوں پر تو جو گذرتی وہ اپنی جگہ، راہ چلتے لوگوں کی آنکھیں بھی اچانک یہ آواز سن کر نم ہو جاتیں۔ کہیں ڈوھڑے کے یہ بول:

کرسیں یاد کڈاہیں میکوں پیا مرداہاں جان جلا کے

کہیں ماہیے کے یہ حسرت بھرے لفظ:

تیڈی جدائی والا میڈے کفن تے داغ ہوسی

کہیں ناطق کے الفاظ میں موت کا یہ دلگداز تصور:

ناطق کوک معشوق دی سن کے وچہ قبر دے لاش وی ہل گئی

اور کہیں نیر سوچ مرحوم کی رقت انگیز وصیت:

یارو　میںنوں　رونا　ناں

عطاء کی درد بھری آواز اور پس منظر میں حیات اور موت کی کشمکش کا وہ عالم جس سے عطاء اس وقت دوچار تھا۔ سننے والوں کے دل لرز لرز جاتے۔ خاص طور پر نیر سوچ مرحوم کا گیت تو ان لوگوں کے دلوں میں خنجر بن کر اتر جاتا، جنہوں نے چند ہی روز پہلے عطاء کو سسک سسک کر یہ گیت گاتے سنا تھا۔

کسی بھی حوالے سے عطاء کے قریب رہنے والے لوگوں کی اہمیت میں یک لخت اضافہ ہو گیا۔

''معاف کیجئے گا بھائی جان! آپ کو تو صحیح پتہ ہو گا۔ اب کیا حال ہے عطاء کا؟'' لوگ یار

لوگوں کو راہ چلتے روک کر بڑے پُر اُمید اشتیاق سے پوچھتے۔

''ٹھیک ہے۔۔۔اب۔۔۔تقریباً۔۔۔پہلے سے کچھ بہتر ہے۔'' عطاء سے اپنے خصوصی رابطے کا بھرم قائم رکھنے کے لئے یہ جھوٹ بے شمار لوگوں کو بار بار بولنا پڑا۔

عیادت کے لئے لاہور آنے جانے والے لوگوں کے انکشافات سن کر بے اختیار حالی کا یہ شعر یاد آ جاتا۔

کس کا یقین کیجئے، کس کا یقین نہ کیجئے

لائے ہیں بزم یار سے دونوں خبر الگ الگ

میانوالی میں عطاء کے دوسرے احباب کے علاوہ ہمارے گھر میں بھی عطاء کی خیریت معلوم کرنے کے لئے خواتین کا تانتا بندھا رہتا ہےاور ہم ٹیلی فون پر عصمت گل عصمت سے تازہ ترین معلومات حاصل کر کے ان میں الفاظ کی مناسب ہیرا پھیری کرنے کے بعد عطاء کی ان خیر اندیش خواتین کی تشفی کرتے رہے۔

''اب ٹھیک ہے، خالہ۔۔۔بالکل اللہ کا فضل ہے۔۔۔۔حالت بہت نازک تھی مگر اللہ نے خصوصی کرم کیا۔ یہ سب آپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔''

یہ سن کر ہماری لاتعداد خالائیں، بھابھیاں اور بہنیں ہمیں دعائیں دیتیں، آنسو پوچھتی، سجدہ شکرادا کرنے کے لئے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتیں۔

''اب کیا حال ہے عطاء کا؟'' داؤد خیل سے آئی ہوئیں ایک بزرگ خاتون نے پوچھا۔

''اللہ کا شکر ہے۔اب وہ بالکل ٹھیک ہے۔ابھی ابھی ٹیلی فون پر ایک دوست سے بات ہوئی ہے۔'' ''مولا تیرا شکر ہے۔'' انہوں نے اطمینان کا گہرا سانس لے کر کہا۔ ''میں نے اس کی صحت یابی کے لئے دس نفل نماز کی منت مانی تھی۔اب گھر جاتے ہی یہ منت پوری کروں گی۔''

حادثے کے تین دن بعد سہ پہر کے وقت میں ڈرائنگ روم میں چند مہمانوں کے ساتھ بیٹھا تھا کہ گھر کے اندر کھلنے والے دروازے پر زور کی دستک ہوئی۔میں فوراً اٹھ کر اندر آیا۔سب اہلِ خانہ دم بخود بیٹھے تھے۔

''ابو، چچا جان۔۔۔۔۔'' ننھے اکرم نے کہا۔

اس سے آگے میں کچھ نہ سن سکا۔

''جھوٹ ہے، بیٹے، یہ سب جھوٹ ہے۔یہ افواہ کسی دشمن نے اڑائی ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے چلا کر کہا۔مگر بات میرے کانوں میں پڑ چکی تھی۔

دل کی لڑکھڑاتی دھڑکنوں کو سنبھالا دینے کے لئے میں نے فوراً Indiral کی گولی پانی

کے ساتھ حلق سے نیچے اتاری اور بھاگتا ہوا گھر سے باہر نکلا۔ ایک دوست کی دکان سے ٹیلی فون پر عصمت سے رابطہ قائم کیا۔ جواب میں عصمت کی آواز میں ''ہیلو'' سن کر کچھ اطمینان ہوا کہ خدانخواستہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو عصمت اس وقت اپنی دکان پر موجود نہ ہوتا۔

''عصمت، میں نے ایک بہت بری بات سنی ہے۔''

''کون سی بات سر''

''بھئی بہت بری بات ہے۔ اللہ کرے غلط ہو۔ اچھا یہ بتاؤ آج لالا سے رابطہ ہوا تھا؟''

''جی ہاں! ابھی تھوڑی دیر پہلے بات ہوئی ہے۔ اب حالت پہلے سے کافی بہتر ہے۔''

''اللہ تیرا شکر ہے۔'' میں نے بے اختیار چلا کر کہا اور عصمت کی بات درمیان میں چھوڑ کر ٹیلی فون بند کر دیا۔ گھر واپس آ کر بچوں کو بتایا کہ میرا اندازہ درست تھا۔

ہوش وحواس بحال ہوئے تو دریافت کرنے پر بچوں نے بتایا کہ یہ ہولناک افواہ ساتھ والے گھر کے کسی فرد نے شہر میں کسی سے سنی تھی۔ خدا جانے یہ لرزہ خیز جھوٹ کس کی اختراع تھا۔ بہر حال یہ افواہ پورے شہر میں جنگل کی آگ کی سی تیزی سے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل چکی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ صرف میانوالی ہی نہیں، پورا ملک اس کی لپیٹ میں آ چکا ہے۔ وہ دن لاکھوں دردمند دلوں پر قیامت بن کر گذرا تھا۔

بعض ناگہاں مجبوریوں کے باعث میں فوری طور پر لاہور نہ پہنچ سکا۔ چند روز بعد اطمینان کا سانس نصیب ہوا تو بھائی سلیم احسن، مہر زمان خان، لیاقت علی خان اور زوار حسین خان کے ہمراہ زوار حسین کی گاڑی میں فوراً لاہور کی راہ لی۔

ہم لوگ تقریباً تین بجے لاہور پہنچے۔ میو ہسپتال کے سرجیکل وارڈ میں عطاء کمرہ نمبر ۱۸ میں مقیم تھا۔ عیادت کے لئے آنے والوں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ عطاء اس وقت سو رہا تھا۔ دروازے کے باہر ایک کرسی پر احسن خان، ان کے سامنے ایک بنچ پر شاہد خان اور فدا، اور قریب ہی فرش پر لالا شفاء بیٹھے تھے۔ میکدے کے ان شوخ اور خوش مزاج رندوں کو پہلی بار چپ چاپ سوگوار بیٹھے دیکھ کر دل بھر آیا۔ ابھی ان لوگوں سے علیک سلیک کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا کہ کمرے سے لالا ثناء اللہ (عطاء کا چھوٹا بھائی) باہر نکلا اور اس نے بتایا کہ عطاء جاگ اٹھا ہے۔ لوگوں کا ایک بھرپور ریلا کمرے میں داخل ہوا۔ ہمیں عطاء کے بیڈ سے دور، کمرے کے ایک کونے میں کھڑے ہونے کی جگہ بمشکل مل سکی۔

ہجوم ذرا کم ہوا تو عطاء کی نظر ہم سب پر پڑی۔ ایک سوگوار سی مسکراہٹ اس کے زرد

چہرے پر نمودار ہوئی۔ ہم آگے بڑھے۔ مصافحہ ہوا۔

''تم اب آ رہے ہو؟ نو دن بعد؟'' عطاء نے شکوہ کیا۔

''بہت مجبوری تھی، لالا۔''

''اور اگر مجھے کچھ ہو جاتا تو؟''۔

''تمہیں کچھ نہیں ہو سکتا لالا۔ تم دعاؤں کی امان میں ہو اور دعا کی طاقت کا اندازہ تم سے بہتر کسے ہو سکتا ہے؟ اس حادثے سے تمہارا زندہ و سلامت گذر جانا ایک ایسا معجزہ ہے جو انسانی طاقت کو کجا، انسانی عقل کی دسترس میں بھی نہیں آ سکتا۔''

لوگوں کا ہجوم ہر لمحہ بڑھ رہا تھا۔ ہر شخص عطاء کے قریب آ کر اس کی خیریت کا حال اس کی اپنی زبان سے سننے کے لئے بے قرار تھا۔ اس لئے ہم نے اس مختصر سی گفتگو کو سر دست کافی سمجھا اور عطاء سے اجازت لے کر واپس آ گئے۔

ہم میانوالی واپس آئے تو عطاء کی خیریت کی فکر کرنے والوں نے ہمیں گھیر لیا۔ اور ہمیں عطاء کے معجزاتی طور پر زندہ و سلامت بچ جانے کی تفصیل بار بار سنانا پڑی۔

ایک بڑی بی کہنے لگیں: ''لاکھ لاکھ شکر ہے اللہ کا، میں ابھی جا کر اپنی بہو کو یہ خوش خبری سناتی ہوں۔ بچاری نے تین دن سے کچھ کھایا پیا نہیں۔ کہتی ہے جب تک میرے بھائی کی خیریت کی خبر نہیں آتی میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔ ہر وقت مصلے پر بیٹھی اپنے بھائی کے لئے دعائیں مانگتی رہتی ہے۔''

ایسی ہی ہزاروں پرخلوص دعاؤں کے طفیل عطاء کو ایک نئی زندگی عطا ہوئی۔ اس نئی زندگی میں ایک خوش آئند تبدیلی جو عطاء کی شخصیت میں دیکھنے میں آئی وہ اس کا اپنے خالق سے قریب تر تعلق ہے جسے وہ پانچ وقت نماز ادا کر کے سدا بہار رکھتا ہے۔

فکر تکمیل نشیمن

عطاء سے ایک حالیہ ملاقات لاہور میں اس کے گھر پر ہوئی۔ گھر کیا ہے بس سر چھپانے کی جگہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا تعمیر کا آغاز تقریباً تین سال پہلے ایک شاندار کوٹھی کے نقشے سے ہوا۔ کاغذ پر تو یہ نقشہ بہت بھلا لگتا تھا، مگر مالی وسائل کی قلت اور تعمیر کے اخراجات کی کثرت کے باعث اس نقشے پر جو عمارت تا حال بن سکی اسے کوٹھی تو کجا، ایک عام سا گھر بھی نہیں کہا جا سکتا، بیشتر کمروں کے دروازے ایک عرصہ سے کواڑوں کے منتظر ہیں۔ کھڑکیوں کے فریم شیشوں کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ دیواریں پلستر کو ترس رہی ہیں اور

فرش ٹائلوں کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔

گھر کی اس کسمپرسی کی وجہ عطاء سے دریافت کی تو آہ بھر کر کہنے لگا:

''لالا اسے مکمل کرنے کے لئے پیسہ کہاں سے لاؤں؟ دولت کی فراوانی تو پہلے بھی کہاں تھی، رہی سہی کسر حادثے نے پوری کر دی۔ تقریباً چھ ماہ بے کار رہا اور اس پر ستم یہ کہ اخراجات میں یکلخت کئی گناہ اضافہ ہوگیا۔ ہسپتال کے اخراجات، دواؤں کا خرچ اور عیادت کو آنے والے مہربانوں کی خاطر داری، یہ سلسلہ مہینوں چلتا رہا جبکہ آمدنی ایک پیسے کی بھی نہ ہوئی۔ یقین جانو حادثے کا خسارہ آج تک پورا نہیں کر سکا۔ بہرحال اللہ کا شکر ہے کہ جان بچ گئی۔ خسارے تو پورے ہوتے رہتے ہیں۔

مستقبل کے بارے میں میرے ایک سوال کے جواب میں عطاء نے کہا:

''اللہ کے مجھ حقیر انسان پر بے پایاں احسانات ہیں، لالا۔ مستقبل بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ میرے خلاف بااثر افراد کا ایک اچھا خاصا منظّم گروہ کام کر رہا ہے، مگر مجھے یقین ہے کہ جب تک اللہ کا کرم شاملِ حال ہے کوئی فرد یا کوئی گروہ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ میرا یہ سر صرف اپنے رب کے حضور میں خم ہوتا ہے لہٰذا انسانوں کی مخالفت مجھے جھکنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔

عطاء نے اپنے مخالفین کی نشاندہی کرنے سے گریز کیا۔ تاہم اس کی باتوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو موسیقی کے راستے ہمارے ہاں مغربی کلچر کی یلغار کی راہ میں عطاء کو سب سے بڑی اور مضبوط دیوار سمجھتے ہیں۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب تک ہمارے کلچر کے اُفق پر لوک موسیقی کا یہ سورج موجود ہے، مغربی موسیقی کا کوئی بھی چراغ روشن نہیں ہو سکتا۔ جہاں یہ سٹیج پر آ جائے وہاں ناچنے تھرکنے والے فنکاروں کو چھٹی کرنا پڑتی ہے۔ اس لئے اس کا کچھ نہ کچھ بندوبست کرنا ضروری ہے۔ ان ظالموں کو کیا خبر کہ ان کے راستے میں یہ دیوار اس عظیم طاقت نے کھڑی کی ہے جس کا مقابلہ آج تک کوئی نہیں کر سکا اور نہ آئندہ کر سکے گا۔

کیوں وہ تنہائی یاد آتی ہے؟
جب ہمیں جانتا نہ تھا کوئی

میرے ماضی کے چند حسین باب منور علی ملک کے پاس تھے۔عیسیٰ خیل کے وہ شب وروز میرا حاصل زیست ہیں۔اسی دور کے جذباتی طلاطم نے آپ کو آپ کا عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی دیا۔منور بھائی نے ساحرلدھیانوی کے الفاظ میں ٹھیک ہی کہا ہے کہ

جو ساز سے نکلی ہے صدا سب نے سنی ہے
جو تار پہ گزری ہے وہ کس دل کو پتہ ہے

مجھ پہ جو گزری اس کا کچھ حال منور بھائی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور قلم سے بیان کر دیا،مگر نہایت احتیاط سے کہ

اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

میری گلوکاری کی طرح منور کی تحریر کا بھی اپنا ایک رنگ ہے۔جو ناگوار باتوں کو بھی ایک حسن دے دیتا ہے۔اس لئے میں ان کی کاوش کی کسی بات سے اختلاف رائے مناسب نہیں سمجھتا اس لئے بھی منور کی مجھ سے محبت ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے

پھر کیا ہوا؟

ثریا بہن۔۔۔!

کتاب چھپی تو چند ہی روز بعد ثریا بہن کا یہ شکوہ موصول ہوا کہ اچھے بھائی ہو۔ چھوٹی بہن سیما کا ذکر تو کتاب میں کر دیا، بڑی بہن کو بھول گئے۔ یہ سن کر شرمندگی سے پانی پانی ہو گیا، شکوہ سو فیصد بجا تھا اس لئے جواب میں کچھ کہہ تو نہ سکا البتہ دل میں یہ عہد کر لیا کہ اب تو کچھ بھی ہوا گر زندگی نے وفا کی تو کتاب کا دوسرا ایڈیشن ضرور چھپواؤں گا، اور دوسری چھوٹی بہن سے (ثریا عطاء سے تو بڑی ہیں، مگر مجھ سے عمر میں چھوٹی ہیں) معافی تحریری صورت میں مانگوں گا۔

آج یہ عہد پورا کرنے کی توفیق نصیب ہو ہی گئی ہے۔ ثریا بہن، مجھے معاف کر دیا نا؟۔۔۔ عطاء کی والدہ محترمہ کی طرح ثریا بہن بھی عطاء سے بے پناہ محبت کرتی ہیں۔

عطاء سے پہلی ملاقات کے لئے جب میں اپنے دوست فضل داد کے ہمراہ عیسیٰ خیل پہنچا تھا تو ثریا بہن کے دیور محمد احسن خان کا مہمان ہوا۔ یوں عیسیٰ خیل میں میرے لئے پہلی چائے ثریا بہن نے بنائی تھی۔ ان کے شوہر ریاض احمد خان سے بھی وہیں تعارف ہوا۔ بعد میں جب گورنمنٹ کالج عیسیٰ خیل میں میرا تقرر ہوا تو پھر تو میں عطاء کے گھر کا ایک فرد بن گیا۔ اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ ثریا بہن کا مقام میرے دل میں کیا ہوگا۔ ماں کے بعد بہن سے زیادہ مقدس رشتہ اور کون سا ہو سکتا ہے؟

ثریا بہن کے بیٹے ثمر کی موت عطاء کے خاندان کی تاریخ میں سب سے دردناک سانحہ تھی۔ ہائے کتنا پیارا بچہ تھا! عطاء کا لاڈلا، ماں باپ کی آنکھوں کا نور، نانا نانی کے دل کا سرور۔ جب میں عیسیٰ خیل میں تھا تو ثمر خان بمشکل تین چار سال کا تھا۔ دن کا زیادہ تر وقت عطاء کے ساتھ ہی گزارتا۔ ہم عطاء کے سب دوست بھی اس سے بہت پیار کرتے تھے۔

عطاء کے خاندان میں اس درد کی ٹیس اب بھی محسوس کی جاتی ہے۔

کچھ چاہنے والے اس کے

بالا بھرا (محمد اقبال کوچوان)

سیما بہن جب یہاں ایک پرائیویٹ کلینک میں زیرِ علاج تھی تو عطاء اور اس کے والدین کچھ دن اس کے ساتھ یہاں میانوالی میں رہے، ان دنوں ان کے آنے جانے کے لئے ایک تانگہ ہر وقت دروازے پر کھڑا رہتا۔ جب عطاء بہن کے لئے خون دینے سول ہسپتال گیا تو ہم لوگ اسی تانگے پر ہسپتال پہنچے اور پھر اسی پر واپس آئے۔ یہ تانگہ بالے بھرا (محمد اقبال کوچوان) کا تھا۔ جو چوبیس گھنٹے لالا کی خدمت کے لئے حاضر رہتا تھا۔

لالا کے عاشقوں کا شمار نہیں، مگر اقبال بھرا ان میں سب سے مختلف ہے، بہت ہی سیدھا اور سادہ آدمی ہے۔ اور ہر سادہ اور سیدھے آدمی کی طرح بہت دکھی بھی۔ والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ والدین بچپن ہی میں ساتھ چھوڑ گئے۔ ماموں کے گھر رہتا ہے۔ بہت عرصہ کوچوانی کی۔ اب ایک چھوٹی سی دکان بنا رکھی ہے، پچیس تیس برس پہلے، جب لالا کی گلوکاری میکدے تک محدود تھی، اس زمانے کے بہت سے نایاب البم اقبال کے پاس موجود ہیں۔

لیاقت علی خان

لالا سے محبت تو بہت لوگ کرتے ہیں مگر لیاقت علی خان کی محبت کا انداز سب سے الگ ہے۔ لالا کی خیر خواہی کا جتنا خیال یہ رکھتا ہے، شائد ہی کوئی بیٹا اپنے باپ کا اتنا خیال رکھتا ہو اسی لئے لالا بھی اس کو اپنا دوست نہیں، بیٹا سمجھتے ہیں، لالا دنیا میں جہاں بھی ہوں لیاقت ان سے باقاعدہ رابطہ رکھتا ہے۔ فون کے خرچ کا آپ خود اندازہ کر لیجئے۔ اور خیر خواہی کا یہ انداز بھی دیکھئے کہ لالا جی مزے سے انگلینڈ میں بیٹھے ہیں اور ان کے مفادات کے لئے لوگوں سے پنگے یہ لیتا رہتا ہے اس کے وتہ خیل کیسٹ ہاؤس پر آ کر کوئی گاہک یا کوئی دوست بھی اگر لالا کے خلاف ایک لفظ بھی کہہ دے تو لیاقت کہتا ہے۔

''توں ہنڑ ویندا انظر آ''

لیاقت کی محبت کا انداز ہر لحاظ سے نرالا ہے۔ لالا کی کوئی بات اسے اچھی نہ لگے تو اُس سے لڑنے کی بجائے باہر جا کر کہیں تنہائی میں رونے بیٹھ جاتا ہے۔ لالا کو پتہ چل جائے تو فوراً اسے مناتے ہیں۔ لالا اور یہ پیار سے ایک دوسرے کو ''ڈھولا بھیڑا'' کہتے ہیں۔

لیاقت بہت اچھا کمپوزر اور گلوکار بھی ہے۔ اس کی گھمبیر بھاری آواز لالا کی آواز سے خاصی ملتی جلتی ہے۔ مگر لیاقت واقعی ''ڈھولا بھیڑا'' ہے۔ اپنی اس خداداد صلاحیت سے ذرا بھی فائدہ نہیں اٹھاتا۔ پتہ نہیں کس کے لئے سنبھال رکھی ہے؟

لالا کی محبت نے ہی اسے کیسٹوں کے کاروبار کی راہ دکھائی۔ جب ہمارے کالج میں پڑھتا تھا تو اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے میرا اور پروفیسر سلیم احسن کا چہیتا طالب علم تھا۔ ہم اسے طالب علم کی بجائے بیٹا سمجھتے تھے۔ کالج سے فارغ ہونے کے بعد یہ ہمارے بہت قریب رہا۔ اور اب تو اتنا قریب ہے کہ میں اسے اپنا پانچواں بیٹا سمجھتا ہوں۔

کیسٹوں کا کاروبار شروع کرنے سے پہلے اس نے مجھ سے اور پروفیسر سلیم احسن سے مشورہ کیا تو اس کا رجحان دیکھ کر ہم نے فوراً اسے اجازت دے دی۔ ادارے کا نام ''سرائیکی سر سنگت'' میں نے تجویز کیا۔ افتتاح پروفیسر سلیم احسن نے کیا۔ ہماری دعائے خیر کام کر گئی۔ اللہ کے فضل و کرم سے کاروبار نے اتنی ترقی کی کہ چند ہی سال میں سرائیکی سر سنگت کے علاوہ وتہ خیل کیسٹ ہاؤس اور سانول میوزک سنٹر کے نام سے دو اور ادارے بھی بن گئے۔ وتہ خیل کیسٹ ہاؤس لیاقت نے خود سنبھالا اور سرائیکی سر سنگت اپنے ذہین بھائی کوثر حیات خان کے سپرد کر دیا۔ تیسرا ادارہ سانول میوزک سنٹر لیاقت علی کے بھائی شوکت حیات خان چلا رہے ہیں۔

محبت کے اظہار میں لیاقت تھوڑا سا دیوانہ بھی ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک دن اپنی دکان پر ایک گاہک سے بات کرتے ہوئے کہنے لگا۔

بھائی دنیا میں میرے تو صرف تین ہی آدمی ہیں، لالا عیسیٰ خیلوی، پروفیسر منور علی ملک اور پروفیسر سلیم احسن۔ باقی ساری دنیا بھی فنا ہو جائے تو میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا؟

لالا کے سوا کسی گلوکار کی تعریف نہیں سن سکتا۔ ایک دن ایک گاہک نے کہا کہ آپ نے فلاں گلوکار کی نئی کیسٹ سنی ہے؟

لیاقت نے جواب دیا'' بھائی ساڈا تاں کاروبار اے اساں تاں بٹیرے وی سنڑ دے راھندے آں''

لیاقت بہت محبت کرنے والا انسان ہے۔ اس کا دل سیدھا اور سادہ ایک ننھے بچے کی طرح پیار کا پیاسا ہے۔ اس لئے لیاقت کی محبت وہی انسان حاصل کر سکتا ہے، جو چھوٹے چھوٹے بچوں کو خوش رکھنا جانتا ہو۔ یعنی انہی کی طرح سیدھا اور سادہ ہو۔ چالاک اور ہوشیار آدمی کو لیاقت کی

محبت راس نہیں آتی۔ایسے لوگوں کے لئے لیاقت کے پاس ایک ہی فقرہ ہے۔

''بھائی توں ہنڑ ویندا نظر آ''

وتہ خیل کیسٹ ہاؤس پر لیاقت کی معاونت اس کا چھوٹا بھائی محمد رمضان اور شفاء اللہ کرتے ہیں۔یہ دونوں بہت پیارے بچے ہیں۔لیاقت کے مزاج کو سمجھتے ہیں۔اس لئے یہ کبھی ''ویندے نظر نہیں آتے۔''

عصمت گل خٹک

خوش رو،خوش گفتار،خوش تحریر عصمت گل خٹک عطاء کا ایک ایسا دوست ہے جس کی عطاء سے محبت کا مرکز عطاء کی گلوکاری نہیں بلکہ اس کی ذات اور شخصیت ہے۔میانوالی میں عطاء چند منٹ کے لئے بھی آئے عصمت سے ضرور ملتا ہے۔اس لئے لوگ عصمت کی آٹو پارٹس کی دکان کو لالا کا دفتر معلومات INQUIRY OFFICE سمجھ کر لالا کے بارے میں اس سے استفسار کرتے رہتے ہیں۔اور جواب میں عصمت کمال انکسار سے اپنی لاعلمی کا اظہار کرتا رہتا ہے۔کیونکہ وہ جانتا ہے کہ لالا سے ملاقات کے لئے ہر شخص کی خواہش پوری کرنا لالا پر ظلم ہوگا۔بہر حال اس بات میں کوئی شک نہیں کہ عصمت لالا کے قریب ترین احباب میں سے ہے۔اور لالا کو اس پر مکمل اعتماد ہے۔یہ خوش نصیبی لالا کے حوالے سے بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے۔

مرا شہر نہ چھوڑے

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ شخص اللہ کی عطا ہے۔ ان لاکھوں دلوں کے لئے جن کی لڑکھڑاتی دھڑکنیں اس کی آواز سن کر سنبھل جاتی ہیں۔ یہ شخص قدرت کی ایک نعمت ہے۔ ان کروڑوں غم زدہ، مجبور انسانوں کے لئے جن کی زندگی کی ساری محرومیاں اور تلخیاں اس نے اپنی آواز میں یوں سمیٹ لی ہیں جیسے زہر مہرہ کسی انسان کے جسم سے سانپ کا سارا زہر چوس کر اسے اذیت ناک موت سے بچا لیتا ہے۔

اس کی گھمبیر، پرسوز آواز کبھی کسی معصوم بچے کی سسکی، کبھی کسی غم نصیب کی بیوہ کی ہچکی، کبھی کسی مجبور بے بس، ہجر کی ماری دوشیزہ کی دلدوز چیخ اور کبھی کسی بخت جلی ماں کا بین بن کر دلوں کے آر پار ہو جاتی ہے۔

یہ وہ آواز ہے جس نے موسیقی کا ذوق ہی بدل کے رکھ دیا۔ لوک گلوکاری کو اس آواز کے طفیل وہ مقبولیت نصیب ہوئی کہ مرحومہ نازیہ حسن جیسی سراپا پاپ سنگر بھی

ٹاہلی دے تھلے بہ کے

گانے پر مجبور ہو گئی۔ اور کلاسیکی موسیقی کے شہنشاہ امانت علی خان کا شہزادہ اسد امانت بھی

عمراں لنگھیاں پباں بھار

الاپتا نظر آیا۔

عطاء بلاشبہ دنیا بھر میں پاکستان کی پہچان اور ہمارے کلچر کا تعارف ہے۔ اس حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکیلے عطاء نے وہ کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ جو ہمارے سفارتخانے کروڑوں روپے خرچ کر کے بھی نہ دکھا سکے۔ لہٰذا عطاء ہماری قوم کا مان ہے۔

عطاء کے حوالے سے کچھ عرصہ قبل بری بری باتیں سننے میں آ رہی تھیں۔ افواہ یہ تھی کہ عطاء پاکستان چھوڑ کر مستقل طور پر بیرون ملک منتقل ہو رہا ہے۔ بعض اخبارات نے تو منتقل ہو چکا ہے تک لکھ دیا۔ کسی نے یہ خبر اڑائی کہ لاہور میں اس کی املاک کے سودے ہو رہے ہیں۔ کسی نے کہا کہ دفتر کی عمارت کرائے پر چڑھا دی ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ دل تو نہیں مانتا تھا۔ مگر لوگ اس بارے میں پوچھتے تو کوئی قطعی جواب نہ بن پڑتا۔ پچھلے دنوں لاہور میں لالا سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگا منور بھائی بات صرف اتنی

ہے کہ بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں مجھے برطانیہ آنا جانا پڑتا ہے۔ یہ مجبوری ہے۔ رہی وطن چھوڑنے کی بات تو عرض یہ ہے کہ اس وطن عزیز کے لوگوں نے مجھے جو عزت اور محبت دی ہے۔ اس کا صلہ مجھ پر بہر حال واجب ہے۔ میں اتنا احسان فراموش ہر گز نہیں کہ یہ قرض اپنے ذمے چھوڑ کر بیرون ملک بھاگ جاؤں۔ اور یہ قرض اتنا بڑا ہے کہ اس مختصر سی زندگی میں تو شاید ہی ادا ہو سکے۔ لہٰذا میں بھاگ کر کہاں جاؤں گا۔ میرے بھائی میں Defaulter بن کر جینا یا مرنا نہیں چاہتا۔

عطاء کی یہ حوصلہ افزاء وضاحت اپنی جگہ مگر افواہیں ابھی تک گردش کر رہی ہیں اور عطاء کے لاکھوں چاہنے والوں کے دل ایک انجانے خوف کی گرفت میں ہیں۔

عطاء کو جتنا قریب سے میں نے دیکھا ہے اس کی بناء پر میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ عطاء تاش کے ماہر کھلاڑی کی طرح اپنے پتے وقت سے پہلے کبھی نہیں دکھاتا۔ اور یہی اس کی جیت کا راز ہے۔ مگر ہارنے والوں پر جو گزرتی ہے، عطاء کو کچھ اس کا بھی خیال کرنا چاہیئے۔

☆ یہ مختصر سا مضمون 2001 میں اس وقت لکھا گیا،
جب لالا کا ہر چاہنے والا یہی کہتا پھر رہا تھا:۔
''لوگو اسے سمجھاؤ مرا شہر نہ چھوڑے''

☆میانوالی پریس کلب سے سٹی کلر لیب تک☆

لالا نے کہا تھا کہ فلاں تاریخ کو لاہور پہنچ جانا۔ میں نے کہا تھا ''ضرور''۔ اور پھر میں نہ جا سکا لہٰذا یقین تھا کہ لالا اس وعدہ خلافی پر ناراض ہو گا۔ جانے کی ہمت ہی نصیب نہ ہوئی۔ ایسے میں جب میرے محبوب ناصر خان نے اپنے نئے سٹوڈیو سٹی کلر لیب کے افتتاح کے لئے لالا سے بات کرنے کو کہا تو صورتِ حال عجیب سی ہو گئی۔ لالا کی بات نہ ماننے کے بعد کس منہ سے اس سے اپنی بات منواتا۔ اُدھر ناصر سے معذرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اسے محبوب یوں ہی تو نہیں کہہ دیا۔ وہ بہت محبت کرنے والا انسان ہے۔ جس سے پیار کرے اس سے اتنا کرتا ہے کہ یہ خود اس مطلوب کا محبوب بن جاتا ہے اور پھر وہ سابق محبوب اس کا عاشق بن کر اس کی یاد میں آہیں بھرتا رہتا ہے۔ خوش قسمتی سے لالا اُن دنوں بیرونِ ملک مقیم تھا۔ اس لئے فوری آزمائش سے تو میں بچ گیا۔ مگر چند روز بعد لالا نے واپس آنا تھا۔ بہر صورت ناصر سے وعدہ کر لیا کہ لالا سے ضرور بات کروں گا ہی نہیں منوا بھی لوں گا۔

ادھر عصمت گل خٹک نے میانوالی پریس کلب میں ''میٹ دی پریس'' پروگرام کے لئے لالا سے رابطہ کر رکھا تھا۔ عصمت کی بات ٹالنا لالا کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں یہ سوچ کر اور پریشان ہو گیا کہ لالا عصمت کی دعوت پر ادھر آ گیا، اور ناصر کے ہاں جانے کے لئے میری بات نہ مانی تو دل پہ کیا گزرے گی۔ ایک ترکیب ذہن میں آئی عصمت سے کہا کہ لالا کو بتانا کہ منور یہ چاہتا ہے کہ اسی دن آپ سٹی کلر لیب کا افتتاح بھی کر دیں۔ عصمت میرا بہت پیارا بیٹا ہے۔ ناصر سے بھی اس کی رسم و راہ ہے۔ اسے کیا اعتراض ہو سکتا ہے تھا۔

لالا دو دن بعد برطانیہ سے لاہور پہنچا تو عصمت نے فون پر بات کی۔ جواب ملا منور خود مجھ سے بات کیوں نہیں کرتا؟

عصمت نے مجھے یہ بات بتائی تو میں نے ہمت کر کے لالا سے فون پر رابطہ کیا۔

''ہیلو''۔ لالا نے کہا۔

''بہوں ناراض ایں''؟ میں نے پوچھا۔

''کیوں''؟

''یار میں وعدہ جو پورا نہیں کر سکا''۔

''تیکوں جانڑدا نہ ہوواں ہا تاں ضرور ناراض تھیواں ہا''

''تھینک یو، لالا۔ یو آر سو سویٹ۔ اچھا یار ہک ری کوئسٹ اے۔''

''حکم کر''

''ناصر دے سٹی کلر لیب دا افتتاح تیں کرنیں۔''

''اچھا میں 23 نوں آندا پیاں۔ عصمت دے میٹ دی پریس پروگرام کنڑ۔ او بھگتا کے افتتاح ٹھیک رہسی ؟''

'' بلکل ٹھیک۔''

23 ستمبر 2001ء کو سہ پہر تین بجے شہزاد ہوٹل سے لیاقت نے فون کیا کہ لالا پہنچ گیا ہے۔ آپ بھی آجائیں۔

میں وہاں پہنچا۔ ڈائننگ ہال میں کھانا کھایا جا رہا تھا۔ لالا، عصمت، تاجا، لیاقت اور اقبال کوچوان کھانے کی میز پر مصروف تھے۔ شرکت کا شرف مجھے بھی نصیب ہو گیا۔ کھانا کھا کر پریس کلب پہنچے۔

پریس کلب میں لالا کو عوامی عدالت کے سامنے اپنے صفائی پیش کرنا تھی۔ صفائی اس بات کی کہ کچھ عرصہ سے خدا جانے کس نے یہ افواہ اڑا دی تھی کہ لالا پاکستان چھوڑ کر مستقل طور پر لندن منتقل ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لاکھوں چاہنے والوں کے لئے یہ کوئی اچھی خبر نہ تھی۔ سب سے زیادہ غم و غصہ اس کے آبائی دیس میانوالی میں دیکھنے میں آیا۔ عصمت گل نے لوگوں کے ان جذبات کی خبر لالا کو دی تو اس نے کہا ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بہر حال میں خود میانوالی آ کر پریس کلب میں اس افواہ کی تردید کرنا چاہوں گا۔ سو عصمت گل نے روزنامہ نوائے شرر میانوالی کے زیر اہتمام ''میٹ دی پریس'' تقریب کا اہتمام کر دیا۔

اس تقریب میں ''نوائے شرر'' کے چیف ایڈیٹر رانا امجد اقبال کے علاوہ میانوالی کے سینئر صحافی کلیم اللہ ملک مرحوم، ملک عنایت اللہ اعوان، شیر گل خان وتہ خیل، امیر عبداللہ خان سالار اور بہت سے احباب حاضر تھے۔ رانا امجد اقبال نے تقریب کا تعارف کرایا۔ ملک کلیم اللہ مرحوم نے اپنے مخصوص بھرپور انداز میں لالا کو خراج تحسین پیش کیا۔ پھر سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ بعض سوالات خاصے نوک دار تھے، مگر لالا نے نہایت صبر و تحمل سے ہر سوال کا جواب دیا۔ اپنے ترک وطن کی افواہوں کی تردید کرتے ہوئے لالا نے کہا۔ ''اللہ کے فضل و کرم سے مجھے جو محبت اور عزت اس پاک سرزمین کے لوگوں نے دی ہے اس کا صلہ یہ نہیں کہ میں چار پیسوں کی خاطر یہ وطن چھوڑ کر ان لوگوں سے دور جا بسوں۔'' میرا

جینا اور مرنا آپ ہی کے ساتھ ہے۔ پاک وطن چھوڑنے کا میں تصور ہی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وطن چھوڑ نا آپ لوگوں کی محبت کی توہین اور اللہ کی نعمتوں کی ناقدری ہے۔ جب تک میرے بچے بیرون ملک تعلیم حاصل کر رہے ہیں تب تک ان کے پاس آنا جانا میری مجبوری ہے۔ ورنہ یہیں کا ہوں اور یہیں رہنا چاہتا ہوں۔ پاکستان میرا وطن اور میانوالی میرا گھر ہے۔ مجھے اس سے اچھا وطن اور گھر دنیا میں اور کہاں مل سکتا ہے؟

یہ خوبصورت تقریب ختم ہونے کو تھی تو برادرم ملک عنایت اللہ اعوان نے لالا سے کچھ سنانے کی فرمائش کی۔ لالا نے کہا۔ گانے کا ساز و سامان تو یہاں موجود نہیں۔ منور بھائی کی نعت کے یہ دو شعر یاد آ رہے ہیں سماعت فرمایئے۔'' پھر لالا نے اپنے مخصوص پرسوز انداز میں اس فقیر کی نعت کے یہ دو شعر سنائے تو محفل جھوم اٹھی۔

نہ میرے بس میں نظام عالم نہ دل پہ ہے اختیار آقاؐ
اسی کشاکش میں کر لیا ہے ضمیر کو تار تار آقاؐ
نہ جانے جس وقت دستِ تقدیر چھین لے مجھ سے میرا سب کچھ
یہ لفظ زندہ رہیں جہاں میں فقیر کی یادگار آقاؐ

اس تقریب سے فارغ ہو کر ہم کچھ دیر کے لئے پھر شہزاد ہوٹل میں جا بیٹھے۔

امیر عبداللہ خان سالار اپنے والد مرحوم سالار نیازی کی طرح دلیر اور بے باک انسان ہیں۔
انہوں نے لالا سے کہا۔''لالا، مجھے آپ سے ایک شکایت ہے۔عرض کروں۔''
''فرمایئے''۔لالا نے مسکرا کر کہا۔
''بھائی صاحب بات یہ ہے کہ یہاں کے مقامی گلوکار بیچارے بڑی محنت سے گیت تیار کرتے ہیں۔ مگر وہی گیت آپ گا کر ریکارڈ کرا دیتے ہیں۔ تو کیا یہ ان لوگوں پر ظلم نہیں؟''

لالا نے بڑے اطمینان سے جواب دیا'' سالار بھائی، یہاں کے موسیقار اور شاعر حضرات آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔ جب یہ لوگ لاہور جا کر مجھے کہتے ہیں کہ لالا جی یہ گیت آپ ہی کے لئے لکھا ہے اور کمپوز کیا ہے، تو میں وہ گیت ریکارڈ کروا دیتا ہوں۔ اب مجھے کیا پتہ کہ یہ گیت مجھ سے پہلے کوئی اور بھی گا چکا ہے۔''

کچھ دیر بعد ہم لوگ سٹی کلر لیب کے افتتاح کی تقریب میں حاضر ہوئے۔ ناصر نے خاصا اہتمام کیا تھا۔ بہت سے معززین اور حاضرین موجود تھے۔ لالا کی آمد کا سن کر پورا شہر وہاں اکٹھا ہو گیا تھا ۔لالا نے خوبصورت کلمات سے میانوالی کے لوگوں کی محبت کو خراج تحسین پیش کرنے کے بعد سٹی کلر لیب کا

افتتاح کیا۔ بہت سی تصویریں بنیں ۔ لالا نے سٹی کلر لیب کی کامیابی کے لئے دعا کی ۔ پھر ہم سب ناصر سے اجازت لے کر رخصت ہوئے ۔ لالا اپنے گھر (عیسیٰ خیل) چلے گئے اور ہم نے اپنے اپنے گھروں کی راہ لی ۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

میکدہ اور تھا۔۔

30 دسمبر 2002ء کی شام لالا نے میانوالی کے گیت نگار شعراء اور موسیقاروں کو اپنے ہاں عیسیٰ خیل ہاؤس میں مدعو کیا۔ تیس پینتیس افراد کے اس قافلے میں ہم بھی شامل تھے۔ ہم لوگ تقریباً 8 بجے شام عیسیٰ خیل پہنچے۔ لالا نے بہت محبت سے استقبال کیا۔ ہم سے گلے ملتے ہوئے کہا۔

''آ گیا ایں نکے دا پئیو؟''

''ہاں نکے دی ماء'' ہم نے جواب دیا۔

کھانے کے بعد موسیقی کی محفل سجی۔ میکدے کے پرانے ساتھیوں رفیق خان، اعجاز خان اور شنو بھرا کو دیکھ کر دل میں ایک ہوک سی اٹھی کہ کاش یہ محفل میکدے ہی میں ہوتی۔ کہاں وہ میکدے کا سادہ سا ویران اور اداس سا کمرہ، فرش پر کوندر کے پتوں کی چٹائی، زیرو کے نیلے بلب کی سوگوار روشنی، اور کہاں یہ جدید لوازمات سے آراستہ، روشنیوں سے جگمگاتا وسیع و عریض ہال۔ لالا کی پرسوز آواز سننے کا جو مزا وہاں آتا تھا، یہاں کہاں۔

لالا سے اپنی حسرت کا ذکر کیا تو آہ بھر کہنے لگے ''ہاں یار، اگر پہلے بتا دیتے تو۔۔۔''

اتنے بڑے قافلے کو رات گئے دو کلومیٹر کے فاصلے پر میکدے میں منتقل کرنا ممکن نہ تھا کہ باہر کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔

''اچھا پھر کبھی سہی'' ہم نے مجبوراً کہا۔

''ضرور''! لالا نے کہا۔ ''یار میکدے میں گزرے وقت کی یاد مجھے بھی بہت ستاتی ہے خاص طور پر وہ عطاء اللہ اور منور بہت یاد آتے ہیں۔ کیا زمانہ تھا!!''

آج کی اس یادگار محفل میں میرے علاوہ میانوالی سے لیاقت خان، مظہر نیازی، نذیر یاد، یوسف کلیم، صفی اللہ صفی۔ افتخار واصف، لطیف ساجد، عطاء محمد شاہد، امیر حسین امیر، غلام شبیر شاکر، شرافت علی تری خیلوی، طاہر ساقی، شوکت جیون، طارق بلوخیلوی، محمد اقبال کوچوان، رئیس انجم، عیسیٰ خیل سے رفیق خان، اعجاز خان اور شنو بھرا کے علاوہ لالا کے بھانجے قمر اور کزن حمید خان، تاج محمد تاجا اور کچھ قریبی لوگ تھے، دیگر کے نام یاد نہ آنے پر معذرت چاہتا ہوں۔ لاہور سے لالا کے ہمراہ ایک خوش رو مہمانِ خصوصی بھی تشریف لائے تھے۔ لالا کے دائیں جانب وہ تشریف فرما تھے، بائیں جانب یہ فقیر بیٹھا تھا۔

یہ محفل لالا کے آئندہ چند البمز کے لئے اپنے علاقے کے گیت اور دھنیں جمع کرنے کے لیے برپا ہوئی۔

لالا نے تمام شعراء کا کلام بہت توجہ سے سنا۔ بیشتر شعراء کا کلام اسد نے گا کر سنایا۔ ہار

مونیم پہ استاد امیر حسین امیر، شرافت علی تری خیلوی، استاد شبیر شاکر اور طاہر ساقی باری باری آتے رہے۔ طبلے پہ سنگت بشیر ماہی، شوکت جیون اور رئیس انجم نے کی۔ بعض شعراء نے اپنا اپنا کلام اپنی ہی کمپوزنگ میں خود گا کر سنایا۔ سب نے سامعین سے بھرپور داد پائی۔ یہ تمام کارروائی لیاقت ریکارڈ کرتا رہا۔ لالا کی فرمائش پہ لیاقت نے ایک گیت بھی سنایا۔

یہ پروگرام تقریباً ایک بجے ختم ہوا تو لالا سے کچھ سنانے کو کہا گیا۔ تھوڑے بہت تکلف کے بعد مہمان خصوصی کی خصوصی سفارش اور دوستوں کے اصرار پر لالا نے ہارمونیم سنبھالا اور اونچے سروں میں جوگ کی درد بھری تان سے ہال گونج اٹھا۔ لالا نے نئی پرانی بہت سی چیزیں سنائیں۔ ہر فرمائش پوری کی۔ آخر میں ہم نے اپنی فرمائش عرض کی۔

ہم سے دراصل میانوالی کے ایک صاحب نے کہا تھا ''آپ کا وہ گیت ہے نا۔۔۔ ''ساوی مورا کین'' وہ گیت ہمیں بہت اچھا لگتا ہے۔ وہاں جا کر لالا سے یہ گیت ضرور سننا۔ ہم نے گیت بتایا تو لالا نے کہا ''مگر وہ گیت تو اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔''

''ایسی کون سی بات ہے۔'' ہم نے کہا اور مظہر نیازی سے کاغذ قلم لے کر ''ا'' سے ''ی'' تک پورا گیت لکھ کر لالا کے آگے ہارمونیم پہ رکھ دیا۔

ایک لمبی آہ کھینچ کر لالا نے کاغذ پہ ایک نظر ڈالی۔ ہارمونیم کے سروں کو چھیڑا اور جوگ کے درد میں ڈوبے گیت کے یہ بول فضا کو سوگوار کر گئے۔

''رٹھی نہ منیساں بہوں ناراض آں ڈھولے تے''

اِدھر لالا نے گیت شروع کیا، اُدھر ہم فون پر ان صاحب کا نمبر ملانے لگے کہ ہمیں ماضی کی اداس یادوں کے ویران صحرا میں بھیج کر وہ خود کیوں اپنے حال کی خوشحال گود میں نیند کے مزے لیتے رہیں۔ افسوس کہ بار بار کوشش کے باوجود ان کا نمبر مصروف ہی ملا۔

بہر حال ان کا شکریہ کہ ان کی فرمائش کے طفیل ہمیں اپنا وہ لالا واپس مل گیا جو بہت عرصہ پہلے یہ گیت اسی طرح ٹوٹ کر گایا کرتا تھا۔ اس گیت کے بعد کسی دوست نے ایک اور گیت کی فرمائش کی تو لالا نے کہا۔

''بھائی ساوی مورا کین، ہمیں اتنی دور لے گئی ہے کہ اب واپسی میں کچھ وقت لگے گا۔ اس لئے فی الحال کچھ اور نہیں گا سکتا۔'' صبح کے تین بج رہے تھے۔ ہم نے واپسی کی اجازت چاہی کہ کچھ دوستوں کو صبح اپنے اپنے کام پر جانا ہے۔ لالا سے رخصت ہوتے وقت یہ طے ہوا کہ لالا تو اسی صبح لاہور چلا جائے گا۔ لیاقت اور میں ایک دن بعد (یکم جنوری) کو لاہور پہنچیں گے۔

حسین یادوں کا خزانہ سمیٹ کر ہم عیسیٰ خیل سے روانہ ہوئے۔ راستے میں کوٹ چاندنہ بس سٹینڈ پر ایک چھپر ہوٹل میں کڑک چائے پی اور صبح تقریباً 4:30 بجے میانوالی آ پہنچے۔

☆توں نئیں آیا☆

جولائی 2001ء کا کوئی دن تھا۔ دوپہر کا وقت۔ میں اردو بازار لاہور میں ایک دوست کے پاس بیٹھا تھا۔ لالا ان دنوں بیرون ملک گیا ہوا تھا۔ اس کی خیر خبر دریافت کرنے کے لئے دفتر سے فون پر رابطہ کیا تو لالا کے سیکرٹری تنویر شاہد محمد زئی نے کہا۔ ''ملک صاحب اس وقت آپ کہاں ہیں۔''

''لاہور میں۔ اردو بازار سے بول رہا ہوں۔''

''شکر ہے۔ آپ کی تو ہمیں اس وقت بڑی ضرورت ہے۔''

''حکم؟''

''آپ کے گیت کی دھن نہیں بن رہی۔''

''آپ خود یہ گیت گانا چاہتے ہیں؟''

''جی نہیں، لالا کی ریکارڈنگ ہونے والی ہے۔''

''تو کیا لالا باہر سے آ گیا ہے''؟

''جی ہاں کل پہنچے ہیں۔''

''میں آ رہا ہوں۔''

لالا کے دفتر پہنچا تو قالین پر محفل سجی تھی۔ لالا، تنویر شاہد، موسیقار الطاف حیدر، عیسیٰ خیل سے دو احباب اور ایک دوسرے موسیقار سر جوڑ کر بیٹھے تھے۔ اگلے البم کی تیاری پر غور ہو رہا تھا۔ الطاف حیدر صاحب گیتوں کی NOTATIONS لے رہے تھے گیتوں کی دھنیں ایک خاص قسم کے کاغذ پر موسیقی کی ایک مخصوص زبان میں کچی پنسل سے لکھی جاتی ہیں۔ اس تحریری موسیقی کو NOTATION کہا جاتا ہے۔ میرے گیت ''توں نئیں آیا'' کی دھن دوسرے موسیقار صاحب نے بنائی تھی۔ مگر لالا مطمئن نہیں ہو رہے تھے۔ ہارمونیم پر یہ دھن مجھے بھی سنائی گئی۔ دھن اچھی تھی مگر گیت کے مزاج کے مطابق نہیں تھی۔

لالا نے پوچھا تو میں نے اپنی یہی رائے بتا دی۔

''تمہارے پاس کوئی آئیڈیا ہے؟'' لالا نے کہا۔

''ہاں''

''پہاڑی ہوگی' لالا نے چوٹ کی۔ وہ جانتا ہے کہ راگ پہاڑی میری کمزوری ہے''۔
خدا جانے مجھے یہ راگ سب سے اچھا کیوں لگتا ہے؟

''ہے تو پہاڑی'' میں نے کہا۔

''اچھا، جو بھی ہے، سناؤ''

میں نے گیت کے ایک دو بول سنائے۔ لالا نے ہارمونیم پر تعاقب کیا۔ میں سنا چکا تو کہا

''پھر سناؤ''۔

دوسری بار سنانا شروع کیا تو لالا کے چہرے پر شریری مسکراہٹ دیکھ کر اطمینان ہو گیا کہ دُھن لالا کو لگ گئی ہے۔ لالا کی یہ مسکراہٹ بالکل ویسی ہی تھی جیسے کچی پہلی جماعت کے بچے سے نظم یا سبق سن کر ماں کے چہرے پر نمودار ہوتی ہے۔ حیرت، فخر اور محبت سے لبریز یہ مسکراہٹ جسے نصیب ہو جائے اس کا مزہ وہی سمجھ سکتا ہے۔

ایک دو بار مجھ سے یہ گیت سن کر لالا نے کاغذ مجھ سے لے کر پارمونیم پر رکھا اور خود گیت چھیڑا۔ پھر تو بات ہی کچھ اور تھی۔ گیت کے اندر کا درد لالا کی گھمبیر پر سوز آواز میں رچ کر فضا میں گھلنے لگا تو کمرے کے در و دیوار بھی آنسو بہاتے دکھائی دیئے۔

قدرت نے کیسا عجیب کمال دیا ہے اس آواز کو کہ اس کی لے تیر کی طرح دلوں میں اتر جاتی ہے!!!

گیت اوکے (OK) ہو گیا تو الطاف حیدر صاحب اس گیت کی دھن نوٹ کرنے لگے۔

اچانک میرے ذہن میں ایک سبز بتی سی جلنے بجھنے لگی۔ ایک الاپ سوجھ رہا تھا۔ لالا سے اجازت لے کر الطاف حیدر کو سنایا تو تحسین آمیز نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے انہوں نے یہ الاپ بھی نوٹ کر لیا۔

گیت کے ہر انترے کے آخری بول کے بعد وائلن کا یہ مختصر سا الاپ درد کے تاثر کو روح کی گہرائیوں تک پہنچا دیتا ہے۔

میں موسیقی کا کچھ نہیں لگتا، مگر لالا کی موجودگی میں خدا جانے کیوں انسپائر ہو کر اس میدان میں بھی تھوڑی بہت دخل اندازی کرنے کو جی چاہتا ہے، اور پھر مزے کی بات یہ ہے کہ بسا اوقات لالا میری یہ دخل اندازی برداشت ہی نہیں، پسند بھی کر لیتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مر اانتظار نہ کر سکے

یہ کیا ہوگیا!! عبدالرزاق خان بھی اٹھ گیا۔ تقدیر نے میرے ماضی کی کتاب سے ایک اور ورق نوچ لیا۔ اسے کیا خبر کہ یہ ورق میرے لئے کتنا اہم تھا۔ بھائیوں سے زیادہ پیار دینے والے میرے بچپن کے دوست بس دو چار ہی تھے۔ ایک دو اس سے پہلے رخصت ہوگئے یہ شائد آخری تھا میرا ایسا کوئی اور دوست اس دنیا میں موجود بھی ہو تو پتہ نہیں کہاں ہوگا کس حال میں ہوگا؟ اس راہ سے کبھی گذرے گا نہیں۔ چاروں طرف دور دور تک تنہائی ہی نظر آتی ہے۔

رزاق خان میرے بچپن کے کلاس فیلو، بہت ہی پیارے دوست اور عطاء کے بہنوئی تھے اس کتاب کے پہلے ایڈیشن میں میں نے سیما بہن والے باب میں ان کے بارے میں بھی کچھ لکھا تھا۔

عبدالرزاق خان عرف کالا خان عیسیٰ خیل کی معروف سماجی شخصیت ڈاکٹر محمد نواز خان نیازی کے بڑے صاحبزادے تھے۔ دودھ جیسی سفید رنگت، روشن حسین چہرہ، چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، غرض مردانہ وجاہت کا ایک حسین شاہکار تھے۔ والدین نے شائد نظر بد سے بچانے کے لئے کالا خان کہنا مناسب سمجھا تو دودھ جیسی سفید رنگت کے باوجود یہی نام شہر بھر میں معروف ہوگیا۔

رزاق خان نہایت خوش ذوق، خوش اخلاق اور خوش طبع انسان تھے، واپڈا کی ملازمت کے دوران زیادہ عرصہ گجرات میں رہے۔ جن دنوں عیسیٰ خیل میں میکدہ آباد تھا، یہ گجرات میں مقیم تھے۔ اور جب تک یہ وہاں رہے میکدہ کی ایک برانچ گجرات میں بھی رواں رہی۔ لالا ہر مہینے میں ایک دو بار پانچ سات روز کے لئے گجرات ضرور جایا کرتا تھا۔ رزاق خان کے ڈرائنگ روم میں برپا ہونے والی اُن محفلوں کا مکمل ریکارڈ Cassettes کی صورت میں رزاق خان کے پاس محفوظ تھا۔

30 مارچ 2004ء کو میں عطاء کے ماموں ڈاکٹر محمد اقبال خان نیازی کی وفات پر تعزیت کے لئے عیسیٰ خیل گیا تو لالا کے بھائی شنو خان (ثناء اللہ خان) کے ہمراہ مرحوم کے گھر پہنچا۔ رزاق خان بھی وہیں مل گئے۔ مرحوم ڈاکٹر صاحب شنو کے علاوہ رزاق خان کے بھی سسر تھے۔ سیما بہن کی وفات کے بعد رزاق خان کی دوسری شادی مرحوم ڈاکٹر صاحب کی بچی سے ہوئی تھی۔

فاتحہ خوانی کے بعد ہم کافی دیر تک وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ بچپن کی یادوں کا ایک ایک ورق دہرایا گیا۔ رخصت ہوتے وقت میں نے رزاق خان سے کہا۔

’’لالا، کسی دن میں خاص طور پر تم سے ملنے کے لئے عیسیٰ خیل آؤں گا پورا ایک دن ایک ساتھ گزاریں گے۔‘‘

مسکرا کر کہنے لگا’’ دیکھ لیں گے تم اتنے اچھے آدمی تو نہیں ہو۔‘‘

’’نہیں لالا میں ضرور آؤں گا۔ دراصل میں لالا عطاء کی گجرات والی تمام Cassettes ایک بار پھر سننا چاہتا ہوں۔‘‘

رزاق خان کے مسکراتے چہرے پر یکدم ایک سوگوار سنجیدگی طاری ہوگئی۔ آہ بھر کہنے لگا۔

’’لالا وہ سب کچھ تو میں نے ضائع کر دیا‘‘۔

’’ضائع کیوں کر دیا؟ کیوں کیا ظلم تم نے؟‘‘

یار ایک دن میں بازار سے گزر رہا تھا تو انہی میں سے ایک Cassette کی آواز کان میں پڑی۔ عطاء کی وہ Cassette شاید میرے بیٹے سے کسی کے ہاتھوں بازار جا پہنچی تھی۔ مجھے غصہ آ گیا۔ میں فوراً گھر واپس آیا اور وہ تمام Cassettes نکال کر سب کی سب wash کر دیں۔

’’یار یہ تم نے اچھا نہیں کیا‘‘۔

’’بس یار غصہ آ گیا تھا۔ آخر پٹھان ہوں ناں‘‘۔

غصہ تو اب مجھے بھی آ رہا تھا۔ مگر رزاق خان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کچھ کہنے کی ہمت نہ کر سکا۔

رزاق خان مجھے گاڑی تک چھوڑنے آئے۔ بڑے پیار سے مجھے گلے لگایا اور کہنے لگے یار کبھی کبھی آ جایا کرو۔

’’ضرور‘‘ میں نے کہا۔ گلی کا موڑ مڑنے تک رزاق خان دل پر ہاتھ رکھے وہیں کھڑے پیار بھری نظروں سے ہمیں دیکھتے رہے۔

کس کو خبر تھی کہ یہ ملاقات آخری ملاقات ہوگی۔

لالا سے ایک معصوم سی فرمائش

کیا کہوں اس وقت میرے دل پہ کیا گزرتی ہے جب میانوالی یا نواحی دیہات کا کوئی باصلاحیت نوجوان شاعر یہ آس لے کر میرے پاس آتا ہے کہ میں اس کا ایک آدھ گیت لالا تک پہنچا کر یہ گیت اس کے کسی البم میں ریکارڈ کرادوں گا۔ لالا سے میرے دیرینہ تعلقات کی بناء پر اس نوجوان کی توقع کچھ ایسی بے جا بھی نہیں ہوتی کہ لالا میری جائز سفارش رد نہیں کرے گا۔ جب گیت فنی اور معنوی لحاظ سے معیاری ہو اور دل کے تاروں کو بھی چھیڑتا ہو تو لالا جیسے صاحب ذوق فنکار کو اسے رد کر کے ایک غریب اور محبت کرنے والے نوجوان شاعر کی دل شکنی کرنا زیب نہیں دیتا۔ نہ ہی مجھ جیسے کسی سینیئر شاعر کا یرغمال بننا اس کے شایانِ شان ہے۔ یہ درست ہے کہ سینیئر شاعروں کے اپنے اپنے سامعین ہیں جو ہم لوگوں کے گیت سننا چاہتے ہیں لہٰذا ہم سینیئر لوگوں نے لالا کو یہ باور کرا رکھا ہے کہ صاحب مارکیٹ سے فرمائش تو ہمارے گیتوں کی آتی ہے، لہٰذا نئے اور گمنام شاعروں کا کلام گانا آپ کیلئے کاروباری رسک (Risk) ثابت ہوسکتا ہے۔ اور پھر ہم سینیئر لوگ بعض اوقات محض اپنی حاضری لگوانے کے لئے ایسی ایسی فضول چیزیں لکھ دیتے ہیں جو شاعری کی کسی قسم میں شمار نہیں ہوسکتیں، اور لالا بھی محض البم کے آٹھ گیت پورے کرنے کے لئے جو کچھ ہاتھ لگ جائے اسی کو غنیمت سمجھتا ہے۔ تاہم قصور لالا کا نہیں اُس کے پاس اتنی فرصت کہاں کہ گلی گلی پھر کر گیت ڈھونڈتا رہے۔ یہ تو گیتوں کا انتخاب کرنے والے دوستوں کا کام ہے کہ وہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کے لئے لالا کے ہر البم میں دو چار نئے شعراء کے اچھے گیت ضرور شامل کرلیا کریں۔ ڈاک سے جو بھی گیت موصول ہوں ان میں سے اچھے گیت الگ کر کے لالا کو دکھا دیئے جائیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ خاصا محنت طلب کام ہے، مگر میں اس بات پر اصرار اس لئے کررہا ہوں کہ مجھ سے ان لوگوں کے حسرت بھرے اداس چہرے نہیں دیکھے جاتے جو صلاحیت کے باوجود اپنا وجود تسلیم کرانے کے لئے سالہا سال سے در در کی ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں لالا تک رسائی نہ ہوسکنے کے باعث چھوٹے چھوٹے گلوکاروں کی ناز برداریاں کررہے ہیں۔ اور مجھ جیسے سینیئر لوگوں کے ہاتھوں بلیک میل (Blackmail) ہورہے ہیں۔ انہیں ان کا حق تحسین ملنا چاہئے۔ محرومی کا شکار ایسے لوگوں کی دعائیں اللہ کی نظر میں بہت قیمتی ہوتی ہیں۔ ان کی دعائیں ضرور لینی چاہئیں۔

لالا سے میں یہ گذارش کروں گا کہ میرے بھائی میانوالی کی مٹی ابھی بھانج نہیں ہوئی۔ رب

کریم کے فضل وکرم سے اس مٹی میں آج بھی نت نئے پھول کھل رہے ہیں۔ جب بھی فرصت ملے ایک نظر ادھر بھی ڈال لیا کریں کیونکہ ان پھولوں کو نصیب خاک ہونے سے صرف آپ جیسے اہلِ ذوق لوگوں کی نگاہِ قدر شناس ہی بچا سکتی ہے۔ سہروں کی زینت بننے کے لائق پھولوں کو قبروں کی زینت نہ بننے دیجئے۔ ان کی حوصلہ افزائی کرنا اپنی مٹی سے محبت کا تقاضا ہے۔ کیا خبر آپ کی حوصلہ افزائی سے میانوالی کو کوئی بہت بڑا شاعر نصیب ہو جائے۔ اور لوگ یہ کہیں کہ

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی!

لعل و گہر آسمان سے نہیں برستے۔ مٹی میں ہی پائے جاتے ہیں اور پھر میانوالی کی مٹی تو میرے رب کے فضل و کرم سے مالا مال ہے۔

اُس کی راتیں، اُس کی باتیں، اُس کے گیت۔۔۔

یکم سے سات جنوری 2003ء تک لیاقت، میں اور نوجوان شاعر صابر بھریوں لاہور میں لالا کے مہمان رہے۔ اپنے آئندہ تین چار البموں کی تیاری کے موقع پر لالا نے ہمیں اپنے ہاں مدعو کیا تھا۔ البموں کی تیاری میں تو ہم نے کیا مدد دینی تھی۔ ہاں وقت اچھا گذر گیا۔ ان سات دنوں میں ایک ہی البم مکمل ہوا۔ پانچ دن تو صرف گیتوں کے ٹریک بننے میں لگ گئے۔ ٹریک میں صرف گیت کے ساتھ بجنے والے سازوں کی آواز ریکارڈ کی جاتی ہے۔ سازوں کا انتخاب اور ان کی تعداد کا تعین موسیقار کرتا ہے۔ یہ خاصا باریک کام ہوتا ہے ساز گیت کے مزاج اور گلوکار کی آواز کے مطابق نہ ہو تو گیت کا تاثر بگڑ جاتا ہے۔ اور اچھے سے اچھا گیت بھی سامعین کو متاثر نہیں کر سکتا۔ تال (ردم) میں بھی بڑے گھپلے ہو سکتے ہیں۔ طبلہ، ڈھولک یا گھنگھرو وغیرہ میں سے کسی بھی چیز کی آواز ضرورت سے زیادہ اونچی، نیچی، تیز یا آہستہ ہو جائے تو گیت کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔

ریکارڈنگ میں بھی ذرا سی غفلت یا غلطی کیسٹ کو مارکیٹ میں فلاپ، عوام کو مایوس اور گلوکار کو شرمسار کر سکتی ہے۔

لالا کے ساتھ بھی یہ ہاتھ کئی دفعہ ہو چکا ہے کہ کیسٹ اتنی کامیاب ثابت نہیں ہو سکی جتنی لوگوں کو امید تھی۔ ایک کیسٹ کے ایک گیت میں یوں بھی ہوا کہ تیز رفتار گیت کے ساتھ موسیقار صاحب نے بولوں کے درمیانی وقفے میں سارنگی کا طویل کلاسیکل الاپ ڈال دیا اور ردم تقریباً غائب ہی کر دیا۔ اور یوں سارنگی کا یہ خواب آور الاپ اس گیت کو لے بیٹھا۔ کئی اور مثالیں بھی ہیں مگر اسی ایک مثال پر بھی لالا، موسیقار اور ریکارڈسٹ کہیں گے۔ ''پروفیسر صاحب، یہ بڑا ٹیکنیکل کام ہوتا ہے۔ آپ اس چکر میں نہ پڑیں۔ ہم پروفیشنل لوگ یہ باتیں آپ سے بہتر جانتے ہیں۔ لہٰذا آپ اپنی دسترس اردو، انگریزی کی نوک پلک سنوارنے تک ہی محدود رکھیں کہ آپ کا پروفیشن وہی ہے۔''

چلیں صاحب ایسے ہی سہی۔ آگے چلتے ہیں۔

ہاں تو، لالا کے ایک البم کے ٹریک بن رہے تھے۔ شکر ہے کہ اب کی بار نہ تو موسیقار کی نیت میں فتور تھا، نہ ریکارڈسٹ کی مہارت میں کمی۔ موسیقار چھکولہری صاحب خوبصورت، خوش اخلاق، متحمل مزاج نوجوان، اور نامور موسیقار ہیں۔ ان کا کھلا کھلا سرخ و سفید چہرہ اور حسین آنکھیں دیکھ کر ہی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ خوش رو نوجوان کسی کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔

ریکارڈسٹ کاشف بھی ایک خوش صورت ماہر فن نوجوان ہے لالا کے ساتھ کافی عرصہ

سے کام کر رہا ہے۔ جب تک فنی طور پر مطمئن نہ ہو گلو کار کو انگوٹھا نہیں دکھاتا۔ لہٰذا یہ دونوں نوجوان (موسیقار اور ریکارڈسٹ) بہتر سے بہتر نتائج حاصل کرنے کے لئے بار بار Cut کرواتے رہے۔

دن ۴ بجے سے رات ۱۲ بجے تک شفٹ چلتی تھی۔ ہم سب اوپر سٹوڈیو کے ریکارڈنگ روم میں بیٹھ کر یہ دلچسپ کارروائی دیکھتے رہتے۔ ٹریک چلتا اور کمرہ سازوں کی آوازوں سے گونج اٹھتا۔ چھکو صاحب کی بورڈ (Key Board) پہ اور کاشف ریکارڈنگ ڈیسک پہ مصروف ہو جاتے۔ اچانک چھکو صاحب سر اٹھا کر ٹریک روکنے کا اشارہ کرتے۔ کی بورڈ سے کوئی نیا آئیڈیا سروں کے روپ میں ڈھل کر نکلتا اور پہلی ریکارڈنگ کو مٹا کر اس کی جگہ لے لیتا۔

(آپ ان ٹیکنیکل باتوں سے بور تو نہیں ہو رہے؟)

بعض اوقات لالا ٹریک رکوا کر اپنا آئیڈیا لگواتا۔ ایک آدھ بار ہم نے بھی دخل در معقولات کی۔ پہلے لالا کے کان میں آئیڈیا بتایا۔ لالا نے پسند کر لیا تو ان سے کہا۔ ''چھکو صاحب ہماری مداخلت بے جا سے ناراض تو نہیں ہو جائیں گے؟''

''وہ ایسے آدمی نہیں'' لالا نے کہا۔

ہم چھکو صاحب کے قریب پہنچے، انہوں نے کی بورڈ روک کر بڑے پیار سے ہمیں دیکھا۔ ہم نے آئیڈیا بتایا۔ چھکو صاحب نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ کی بورڈ کے سروں کو چھیڑا اور کمرے میں ہمارا آئیڈیا گونج اٹھا۔

بعض گیتوں کے لئے مخصوص ساز کار بلوائے گئے۔ ایک گیت کے لئے رباب نواز حاضر ہوا۔ ایک اور گیت کے لئے شہنائی نواز۔

ریکارڈنگ کے دوران لالا کے خصوصی مہمان بھی آتے جاتے رہتے۔ ایک دن محترمہ سلمیٰ آغا تشریف لائیں۔ لالا نے ہمارا ان سے تعارف کروایا۔ فلم اور موسیقی کی دنیا کی اتنی بڑی شخصیت سے متعارف ہونا ہمارے لئے بجائے خود ایک اعزاز تھا۔

لالا اس وقت میرا گیت۔ ''تم بھول گئے ہو چن ماہی'' گا رہا تھا۔ سلمیٰ آغا کچھ دیر لالا کی مدھر آواز پہ سر دھنتی رہیں۔ پھر لالا کے ساتھ مل کر گانے لگیں۔ پھر کہا بہت اچھا گیت ہے۔''

لالا نے میری طرف اشارہ کر کے کہا ''یہ ان صاحب کا لکھا ہوا ہے۔'' میڈم سلمیٰ نے تحسین آمیز نظروں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''بہت اچھا گیت لکھا ہے آپ نے۔'' مفت میں اپنے نمبر بنتے دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھا۔ میز سے کاغذ اٹھا کر اس پر ''جو تم سے کہہ نہ سکا'' کی آخری غزل

اپنی اپنی ہے زندگی تنہا

لکھ کر ان کی نذر کر دی۔ لالا نے کاغذ ان سے لے کر غزل پڑھ کر سنائی۔ بہت خوش ہوئیں۔ میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

''سر! میں اردو بول تو لیتی ہوں، پڑھ نہیں سکتی۔'' آپ Please یہ غزل انگریزی حروف

تبھی میں لکھ دیں۔انگریزی کا پروفیسر ہونا کام آ گیا۔میں نے ان کے ارشاد کی تعمیل کر دی۔

ہر رات بارہ بجے کے قریب کام ختم کرنے کے بعد کھانا کھایا جاتا۔اور پھر لالا ہارمونیم لے کر نغمہ سرائی کرنے بیٹھ جاتا، زیادہ تر درد بھری اردو غزلیں ہی گاتا۔پھر ہم لوگوں کی فرمائش پر انڈین فلمی گیت بھی سناتا۔ایک شب لتاجی کا گیت

لگ جا گلے کہ پھر یہ حسیں رات ہو نہ ہو

گا رہا تھا تو چھکولہری صاحب نے اپنی جیب سے پانچ سو روپے کا نوٹ نکال کر ہارمونیم پہ رکھتے ہوئے کہا۔

''جیو لالا۔یہ سر جو ابھی آپ نے لگایا ہے، کوئی عطائی (خداداد صلاحیت کا مالک) ہی لگا سکتا ہے۔استادوں کے مارے ہوئے گلوکار یہ سر ہرگز نہیں لگا سکتے۔''

لالا نے کہا ''حاضرین'' یہ نوٹ میں فریم میں لگوا کر اپنے دفتر کے اسی کمرے میں لگاؤں گا۔

''وہ کیوں''ہم سب نے پوچھا۔

وہ اس لئے کی موسیقی کی تاریخ میں یہ پہلا نوٹ ہے جو کسی موسیقار کی جیب سے نکلا ہے۔ ورنہ ہم نے تو ہمیشہ ان مہربانوں کی جیبوں میں نوٹ جاتے دیکھے ہیں، آتے کبھی نہیں دیکھے۔''

اس بات پر چھکو صاحب سمیت سب نے زوردار قہقہہ لگایا۔

آدھی رات کی ان محفلوں میں لالا بہت ڈوب کر گاتا، کلام سارا ہی دردناک ہوتا اسی لئے بعض المیہ گیتوں کے دوران ٹوٹ کر رو بھی دیتا۔کبھی ہم سامعین میں سے کسی کی دکھتی رگ پر کوئی دردناک شعر تر چھا پڑ جاتا تو اپنا بھی یہی حال ہوتا۔سوئے زخموں پر کوئی شعر نشتر کا کام کرتا، کوئی اوپر سے نمک چھڑکتا، صبح 4,3 بجے گلوکار اور سامعین اپنے اپنے آنسو پونچھتے بستروں کا رخ کرتے۔

ایک صبح تقریباً دس بجے لالا کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ ایک کاغذ ہارمونیم پر رکھے کچھ گنگنا رہا تھا ''کیا ہو رہا ہے''ہم نے پوچھا۔

''یہ چند شعر ہیں۔ان کے لئے مناسب دھن بنا رہا ہوں۔''

''بن گئی؟''

''نہیں بن رہی ہے۔''

''میں اپنا لچ تل دوں''؟ ہم نے کاغذ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''تلو'' لالا نے ایک غضبناک نظر ہم پر ڈال کر کہا۔

''دیکھو لالا۔میڈم نور جہاں کا وہ گانا ہے نا۔۔۔''ہم نے کہا ''کون سا؟''

وہ غالب والی غزل۔''مدت ہوئے ہے یار کو مہماں کیے ہوئے۔''اس کی دھن ان شعروں پر ہو بہو

فٹ آتی ہے۔

لالا نے ایک قہر آلود نظر ہم پر ڈال کر کاغذ ہمارے ہاتھ سے لیا۔ اس دھن میں ایک آدھ شعر گایا۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ نکلے۔ آواز بھرا گئی اور اس نے ہارمونیم بند کر دیا۔

''کیوں کیا ہوا؟'' ہم نے کہا۔

''میڈم یاد آ رہی ہیں'' لالا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ''مجھ پر ماں کی طرح مہربان تھیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

دیرینہ بے تکلفی کے باعث مجھ سے چھیڑ چھاڑ بھی چلتی رہتی۔ ایک دن کہنے لگا ''آج کل کیا کر رہے ہو؟''

''انگریزی میں ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔''

''اس کے بعد ایک کتاب اپنے فن پر بھی لکھ دینا۔''

''کون سا فن؟''

''یہی کہ ادھر جو بھی خوبصورت چیز آتی ہے دھاگے کی طرح تمہاری انگلی سے ہی کیوں لپٹ جاتی ہے؟''

کتاب تو میں لکھ دوں، مگر پھر وہ چیزیں مجھے زندہ چھوڑ دیں گی؟''

''کوئی بات نہیں'' لالا نے کہا تمہارے تجربات سے لوگ مستفید ہوں گے۔ جان تو ویسے بھی آنی جانی چیز ہے۔ قومی کاز کے لئے جان کی قربانی۔۔''

تم کیوں نہیں دیتے یہ قربانی۔ اور اب تو دینی ہی پڑے گی کیونکہ میں کتاب میں وہ سب کچھ لکھ دوں گا۔۔''

''میرے ہاتھ سے مرو گے تو سیدھے جہنم میں جاؤ گے۔''

'ایسا ہی سہی۔ وہاں تمہارا استقبال کرنے والا کوئی اپنا بھی تو ہونا چاہئے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مرضیاں والا

ایک رات تقریباً ۹ بجے عیسیٰ خیل سے فون آیا ''بیٹھا ایں نکے دا پیو'' (پہلے ہارمونیم کی آواز پھر لالا کی)

''ہا، نکے دی ماء''

''آ نپڑاں گیت سنڑسیں؟''

''کیہڑا؟''

''مرضیاں والا ڈھولا''

''ضرور''

ہارمونیم کی بلند آواز ہوئی اور لالا گیت کا پہلا مصرعہ سنا کر رک گیا۔

''آگے بتاؤ'' ہم نے کہا

''مجھے کیا پتہ۔ میں نے تو لکھ کر کاغذ تمہیں دے دیا تھا''

''بیڑا غرق۔ وہ تو لاہور رہ گیا''۔

''پھر؟''

''یار کچھ تو کرو۔''

''میں سمجھ رہا ہوں بیٹے، کہ اس وقت تمہاری جان پہ بنی ہوئی ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ فرمائش کس کی ہے؟ مگر۔۔۔؟

''بکواس چھوڑو۔ مجھے گیت لکھواؤ''

ہم نے ذہن پر زور دے کر چند انترے لکھوا دیئے۔

''خوش کیتی بھرا'' لالا نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔ ''میڈے تے بہوں اوکھا ٹیم ہئی''۔

''ہنڑ اے گیت میکوں وی سنڑوا۔''

''ونج ونج آ نپڑاں کم کر'' اور فون بند ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مظہر نیازی کی خانہ آبادی

میانوالی میں شادی بیاہ کی تقریبات میں شمولیت سے عطاء عموماً گریز ہی کرتا ہے۔ آپ ہی بتائیں کہ جب گیت کے ہر بول پر بیس پچیس زندہ دلان میانوالی گلوکار کا منہ چومنے پر بضد ہوں تو گلوکاری کیا ہوگی۔ ان عشق زادوں کا یہ کرم صرف عطاء ہی کے لئے مخصوص ہے۔ عام گلوکاروں کو داد بھی دی جاتی ہے، نوٹوں کی بارش بھی ہوتی ہے۔ مگر یہ منہ چومنے والا پیار صرف عطاء ہی کے نصیب میں لکھا ہے ان اہلِ دل کو یہ کون سمجھائے کہ سٹیج پر گلوکاری کرتے ہوئے تو اتنا سچا پیار کسی محبوب کو وارا نہیں کھاتا۔

مگر مظہر نیازی کی شادی میں عطاء نے اپنے فن کا مظاہرہ کر کے یہ ثابت کر دیا کہ ہر محبوب کا بھی کوئی محبوب ہوتا ہے جس کی خاطر اپنے پکے اور پیارے اصولوں کو بھی بالائے طاق رکھ دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ احتیاطاً شادی میں عطاء کی آمد کو صیغہ راز میں رکھا گیا۔ پہلے مقامی گلوکاروں نے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ اس میں ایوب نیازی، گل تری خیلوی، صابر بوری خیلوی، منظور نیازی، شرافت تری خیلوی اور مظہر بیٹے نے خوب داد سمیٹی۔

عطاء نے ہر گلوکار کو پوری توجہ سے سنا اور داد بھی دل کھول کر دی۔ اور آخر میں جب وہ خود سٹیج پر آیا تو

پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

اس رات عطاء نے بہت ڈوب کر گایا، عام توقع یہ تھی کہ وہ ایک آدھ گیت پر ہی اکتفا کرے گا، مگر وہ مسلسل ڈیڑھ گھنٹہ دلوں کے صحراؤں کو جل تھل کرتا رہا۔ پروگرام میں میرا چھوٹا بیٹا اکرم اور میرا بھانجا شہباز حسین بھی شریک تھے۔ اکرم نے اپنے چاچو کو پہلی بار Live سنا تھا۔ کہنے لگا۔

ابو میرے چاچو واقعی بہت بڑی چیز ہیں۔

ہاں بیٹے، میں نے کہا، وہ چیز کے علاوہ ایک بڑے انسان بھی ہیں۔

میرا یہ جملہ سن کر اکرم اور عطاء دونوں مسکرا دیئے۔

مظہر نیازی کی شادی کی یہ تقریب میانوالی کی ایک یادگار تقریب تھی۔

☆نی سسیئے جا گدی رئیں☆

یاد رہے کہ 1977ء میں عطاء جب اپنے علاقے کی زبان اور موسیقی کے ساتھ منظر عام پر آیا تو موسیقی کی دنیا میں ایک انقلاب آ گیا۔ کوٹھا کلچر کی گھسی پٹی فلمی موسیقی کے ستائے ہوئے عوام نے عطاء کی پرسوز آواز میں اپنی محرومیوں اور ناکام حسرتوں کی بازگشت سنی تو دیوانہ وار اس کے گرد جمع ہو گئے۔

پشاور سے کراچی تک اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا میں یہی آواز گونجنے لگی حتیٰ کہ عالمی ریکارڈز کی کتاب گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ GUINNES BOOK OF WORLD RECORDS میں بھی لالا کو آڈیو موسیقی کے حوالے سے دنیا کا مقبول ترین گلوکار قرار دیا گیا۔ یہ وہ اعزاز ہے جو ملکہ ترنم اور شہنشاہ غزل جیسے بڑے فنکاروں کو بھی نصیب نہ ہو سکا۔ دینے والے کا کرم ہے وہ کریم جس کو چاہے جس طرح چاہے نواز دے۔

اور پھر یوں ہوا کہ کوٹھا کلچر کے مجاوروں کی خود غرض خوشامد کے جھانسے میں آ کر یہ آواز اپنی مٹی کی موسیقی کے سچے سروں سے بچھڑ گئی تو لوگ چیخ اٹھے۔ براہ راست ان کی شکایات لالا تک نہ پہنچ سکیں تو بعض لوگوں نے عطاء کے دوستوں کو وسیلہ بنانے کی کوشش کی۔ مثلاً آزاد کشمیر سے میرے نام ایک خط میں عطاء کے ایک چاہنے والے نے لکھا:۔

> ''ملک صاحب، آپ کی کتاب ''درد کا سفیر'' میں جو عطاء ہمیں ملا تھا وہ آج کل کہاں رہتا ہے۔ اسے کہیں کہ خدارا واپس آ جائے۔ ہم اسے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ لالا، اللہ کریم نے آپ کی آواز طوائفوں والی موسیقی کے لئے نہیں بنائی۔ بلکہ اس موسیقی سے تنگ آ کر تو ہم نے آپ کے سچے سروں سے دوستی کی تھی۔''

اس نوعیت کے بے شمار شکوے ملک بھر سے براہ راست عطاء کو بھی بھیجے جاتے ہیں، مگر بڑے آدمیوں کے پاس اپنی ڈاک دیکھنے کا وقت کہاں ہوتا ہے، اہلِ دفتر کی ''سب اچھا'' کی رپورٹ ہی کافی سمجھی جاتی ہے۔ عوام بھلے بھوک سے مر رہے ہوں سرکار کو اہل کار یہ بتاتے ہیں کہ حضور لوگ دن رات آپ کے بچوں کو دعائیں دیتے ہیں کہ خوش حالی کا ایسا مثالی دوران بیچاروں نے پہلے کہاں دیکھا تھا۔

کبھی کسی دل جلے نے عطاء کے سامنے دل کی بات کہنے کی کوشش بھی کی تو عطاء کے کوئی ہم نشین

ان پر برس پڑے کہ ''دیکھیں بھائی صاحب، عطاء خیر سے موسیقی کا سمندر ہے۔ آپ اسے سرائیکی لوک موسیقی کے کوزے میں کیوں بند کرنا چاہتے ہیں عطاء اب ایک کمرشل گلوکار ہے۔ آپ اس کا کاروبار میانوالی یا سرائیکی علاقے تک ہی کیوں محدود کرنا چاہتے ہیں؟''

عطاء کے ان ہم نشین خیر خواہوں سے کوئی پوچھے کہ صاحب اگر یہ بات ہے تو آپ عطاء کا کاروبار اپر پنجاب کے 5 اضلاع (لاہور، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، شیخوپورہ اور فیصل آباد) تک ہی کیوں محدود کرنا چاہتے ہیں۔ عطاء کے پہلے دس پندرہ البمز Albums جن پر اسے عالمگیر شہرت ملی، ان پر تو کسی نے یہ اعتراض نہ کیا کہ یہ زبان اور موسیقی ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کے یہ البم اپر پنجاب میں بھی اتنے ہی مقبول ہوئے جتنے کسی اور علاقے میں۔ اس وقت تو پر پنجاب سے یہ صدائے احتجاج بلند نہ ہوئی کہ جناب

بوچھنڑاں میں تو یار نہ گھس وے

یا

بنوں دی مہندی

ہماری سمجھ سے بالاتر ہے بلکہ اپر پنجاب میں بھی ان گیتوں پر اسی طرح والہانہ رقص کیا گیا جیسے کہیں اور۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ نیت درست ہو تو سرائیکی اور پنجابی میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا لوگوں کو لالا سے یہ بھی شکایت ہے کہ پچھلے دس گیارہ سال میں لالا کے جو گیت منظر عام پر آئے ان میں 90 فیصد سے بھی زائد گیت صرف ایک ہی راگ (سندھڑا) میں تھے۔ عام لوگ موسیقار تو نہیں ہوتے مگر ان کا فطری ذوق سماعت ورائٹی چاہتا ہے۔ اور ایک ہی راگ کی بار بار تکرار پسند نہیں۔

لوگوں کی یہ شکایت دراصل تو لالا کی بجائے لالا کے مشیروں سے کرنی چاہئے۔ مگر ان کی رسائی وہاں تک ممکن نہیں۔ لہٰذا وہ چاہتے ہیں کہ لالا خود ہی اپنی مشیروں سے یہ کہہ دیں کہ ''بس صاحب، بہت ہو چکی، میری آواز ایک ہی راگ کی غلام نہیں بن سکتی۔ لہٰذا اب کی بار کوئی نئی چیز لائیے۔''

یہ درست ہے کہ قدرت نے عطاء کو جو مقبولیت عطا کی ہے اس کی وجہ سے لالا کا ہر البم مارکیٹ میں چل جاتا ہے۔ مگر تھوڑی سی توجہ اور محنت سے البم کی sale میں ہزاروں کا اضافہ ممکن ہو تو یہ زاید فائدہ کیوں ہاتھ سے جانے دیا جائے۔ مثلاً ابھی پچھلے سال لالا کے البم ''ڈھولا بھیڑا'' نے مقبولیت کا جو ریکارڈ قائم کیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی بیشتر دھنیں سرائیکی لوک موسیقی پر مبنی تھیں اور اس میں ایک ہی راگ کی تکرار کی بجائے ورائٹی تھی۔ کاش کوئی صاحب ایمان داری سے عطاء کے تمام البمز کی sale کے

اعداد وشمار مرتب کر کے عطاء کو دکھاتے تو بات سامنے آجاتی کہ اس کے ساتھ کیسا ہاتھ ہوتا رہا۔ مگر لالا کی مقبولیت اور اس کی کمائی میں شریک لوگوں کے پاس اتنا خلوص کہاں بلکہ بعض لوگوں نے تو لالا کو اپنی گرفت میں رکھنے کے لئے اب اسے اس complex میں مبتلا کر رکھا ہے کہ اس کا تو اب دور ہی گذر گیا۔ قوم کا ذوق ہی بدل گیا۔ لوگ اب گلوکاروں کو سننے کی بجائے انہیں دیکھ کر ان کے مقام کا تعین کرتے ہیں۔

حالانکہ لالا کے لاکھوں چاہنے والے آج بھی موجود ہیں اس کی شخصیت اور آواز میں آج بھی اتنی ہی کشش موجود ہے جتنی پہلے تھی۔ فرق صرف یہ پڑا ہے کہ اب لالا

☆قمیض تیڈی کالی☆

☆اے تھیوا مندری دا تھوا☆

☆پخیر راغلے☆

☆لائی تیں مندری میری☆

☆چن کتھاں گذاری ائی رات وے☆

اور

☆مینوں کرنئیں ساڑ کے کولا☆

جیسے سندر اور سدا بہار گیت نہیں گاتا، بلکہ جلدی میں جو کچھ بھی ہاتھ لگ جائے گا دیتا ہے۔

دھنوں کو پرکھنے کا وقت بھی اب لالا کو نہیں ملتا۔ حالانکہ مارکیٹ کو لالا سے بہتر اور کون جانتا ہے؟۔ موسیقار حضرات سندھڑے اور درباری کی بازاری دھنوں کا جو دالیہ سامنے رکھ دیتے ہیں اسی پر قناعت کر لیتا ہے۔ بھیرویں، جوگ، پہاڑی، ایمن اور مالکونس بیچارے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ لالا یہ ضرور جانتا ہوگا کہ دھن روح کے سرگم کو نہ چھیڑے تو صرف تیز ردم (RHYTHM) لوگوں کو ناچنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ سامعین کو نچوانے کی روایت پاکستان میں اسی نے قائم کی تھی۔ اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ آج بھی یہ کام بخوبی کر سکتا ہے۔ تو پھر وہ یہ کیوں سمجھ بیٹھا ہے کہ اس کا دور تو گذر گیا؟ مجھے تو یقین ہے اور لالا کو بھی یقین ہونا چاہئے کہ لالا ہی وہ واحد فنکار ہے کو خود ناچنے تھرکنے کا تکلف کیے بغیر اپنے مخصوص باوقار انداز میں بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر لوگوں سے والہانہ رقص کروا سکتا ہے۔ آج ویڈیو اور سی ڈی کا دور ہے تو یوں ہی سہی۔ اس کی محفلوں کی ویڈیوز اور سی ڈی بھی تو بن سکتی ہیں۔

آخر میں لالا سے صرف یہ عرض کروں گا کہ میرے بھائی تمہارا دور ختم ہوا، نہ ہوگا۔ کیونکہ تم

جیسا فن کار صدیوں میں ایک پیدا ہوتا ہے اور صدیوں زندہ بھی رہتا ہے بات صرف اتنی ہے جب کہ لوگ نچ کے ہی یار منانا چاہتے ہیں تو اس سلسلے میں آپ ان سے تعاون کیوں نہیں کرتے؟ آپ ان پر یہ مہربانی کریں تو ممکن ہے وہ نچ کے آپ کا یار بھی منا دیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حرف آخر

اس فقیر کی مصروفیات اتنی زیادہ اور اذیت ناک ہیں کہ اپنی پسند کا کام کرنے کی فرصت شاذونادر ہی نصیب ہوتی ہے۔ درد کا سفیر کی اشاعت ثانی کے لئے کام ایک سال قبل شروع کیا تھا۔ مکمل اب بھی نہیں ہو سکا۔ بہت سے اہم احباب کا ذکر ابھی باقی ہے۔ بہت سے واقعات کا بیان ابھی بیان رہتا ہے۔ مگر ناشر اور قارئین ایک سال سے انتظار کی جس اذیت سے دوچار ہیں اس کے پیش نظر مزید تاخیر کی بجائے کتاب فی الفور چھپوانا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں۔

انشاءاللہ اگلی اشاعت میں سب گلے شکوے دور کر دوں گا۔ آپ بس یہ دعا کریں کہ فرصت جلد نصیب ہو جائے۔

اگر اس کتاب میں لکھے کسی ایک لفظ سے بھی کسی دوست کی دل آزاری ہوئی ہو تو اسے نادانستہ سمجھ کر مجھے معاف کر دیں۔ مجھے جاننے والے لوگ جانتے ہیں کہ میں دانستہ کسی کی دل آزاری کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔

میں نے یونہی تو نہیں کہا تھا
آپ کا دل اور ہم توڑیں گے؟
کیا ہم ایسا کر سکتے ہیں؟

منور علی ملک

30.07.004